ڈاکٹر ابرار عبدالسلام
صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان

علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کی مراسلت

(’اقبال بنام شاد‘ کے تناظر میں)

Iqbal was a great poet, philosopher and thinker. He remained in contact with hundreds of scholars through correspondence. The following are some prominent names in this connection: Sayyed Suleman Nadvi, Ghulam Qadir Bilgirami, Akbar Elah Abadi, Molvi Abdul Haq, Attia Begum, Emma Wegenast, Pandit Javahir Lal Nehro, Sayyed Nazir Niazi, Khawaja Hasan Nizami, Akbar Shah Najib Abadi, Khan Muhammad Niazuddin Khan, Qaid e Azam Muhammad Ali Jinnah, Mahatima Ghandhi, etc. One of them is Kishanparshad. He remained prime minister of the State of Hyderabad. Iqbal had a keen desire to have a job at some valuable position at Hyderabad. Unluckily, he failed to materialize this desire. Iqbal's letters were first published by Dr. Mohayyuddin Qadri Zor in 1942 and then by Abdullah Qureishi in 1968. These letters throw light on Iqbal's relations with Parshad. Moreover, these letters help comprehend Iqbal's personal, scholarly and political life. This Article deals with the relationship and thoughts of both the personalities.

ارسطو نے انسان کو معاشرتی حیوان کہا ہے ۔ اس کے نزدیک تنہائی میں زندگی گزارنے والا جانور ہوسکتا ہے یا دیوتا۔بعض اوقات انسان اپنے کسی شدید جذبے کے زیرِ اثر اپنے گرد تنہائی کا ایک ایسا ہالہ بن لیتا ہے جس میں نہ تو کسی اور کو داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے اور نہ خود اس سے باہر نکلنے کی خواہش رکھتا ہے اور اپنے گرد کھینچے ہوئے حصار میں ہی زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن یہ اس کی فطرت نہیں بلکہ خود اختیاری امر ہے۔ انسان معاشرے میں رہنا چاہتا ہے اور میل جول اس کی فطرت ثانیہ ہے۔

انسان کی فطرت کے کئی پہلو ہیں ان میں سے ایک پہلو مکتوب نگاری بھی ہے۔خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے ۔ اس ملاقات کی روایت صدیوں پر محیط ہے۔ ہزاروں سالوں سے انسان اپنے خیالات اور جذبات کی ترسیل کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا رہا ہے۔مختلف فنون کی ایجادات کا باعث بھی انسان کا یہی جذبہ بنا ہے۔مکتوب نگاری کی ایجاد بھی اسی جذبے کی مرہونِ منت ہوگی۔خطوط سے ایک انسان کے دوسرے انسان سے باہمی روابط اور تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔خطوط سے انسان کے مزاج، عادات، خیالات، نظریات ،اور افکار کا پتا ہی نہیں چلتا بلکہ اس کے ذریعے انسان کی ذہنی حالت اور تبدیل ہوتی

ہوئی ذہنی صورت حال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

خطوط بالعموم ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر خط اہمیت کا حامل نہیں ہوتا لیکن جو شخصیات علمی، ادبی ،سیاسی اور مذہبی حوالے سے اہمیت حاصل کر لیتی ہیں ان کے خطوط انھی حوالوں سے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط کے ذریعے ان کے خیالات، جذبات،افکار اور ذہنی تغیرات کا پتا چلتا ہے ۔اس کے علاوہ ان کے عہد کی ادبی، سیاسی ،معاشرتی اور مذہبی صورت حال کو سمجھنے اور پرکھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

غالب ،رجب علی بیگ سرور، واجد علی شاہ،غلام غوث بے خبر،سرسید، حالی،شبلی، آزاد،امیر مینائی، داغ دہلوی، شاد عظیم آبادی، عبدالحق ، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، جوش ملیح آبادی،ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری،فیض احمد فیض اور ن۔م۔ راشد کے علاوہ بیسیوں ادیبوں کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام اقبال کا بھی ہے۔ اقبال نے اپنے عزیزو اقارب، دوست احباب، مداحوں ، دانشوروں، علما اور ادبا کو سینکڑوں کی تعداد میں خطوط لکھے۔اقبال کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ان میں ایک مجموعہ ''اقبال بنام شاد'' بھی ہے۔

اقبال کی زندگی میں ان کے بہت سے معاصرین نے ان کے خطوط جمع کرنے شروع کر دیے تھے ۔ان میں سے کچھ لوگ خطوط کی اشاعت کے خواہش مند تھے۔خان محمد نیاز الدین نے اس خواہش کا اظہار کیا تو اقبال نے اسے پسند نہیں کیا۔ اقبال کا خیال تھا کہ انھوں نے اپنے خطوط بے تکلفانہ تحریر کیے ہیں۔ اس لیے ان کی اشاعت بہتر نہ ہوگی اگر انھیں شائع کرنا بھی ہو تو اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔[۱] اقبال کی زندگی میں ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا البتہ ان کے انتقال کے چند سال بعد ہی سید محی الدین قادری زور نے ''شاد اقبال'' کے نام سے اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے خطوط کو شائع کر دیا۔[۲] اس مجموعے میں اقبال کے ۴۹ اور شاد کے ۵۲ خطوط شامل تھے۔خطوط سے پہلے تیس صفحات کا ایک بھر پور مقدمہ ہے جس میں اقبال اور شاد کی ملاقاتوں اور تعلقات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔زور نے اقبال اور شاد کے خطوط کو تاریخی ترتیب سے درج کیا ہے ۔پہلے اقبال اور پھر شاد کا خط درج کیا ہے ۔خطوط کے اندراج کے اس طریقے سے اقبال کے ذہنی رویوں اور خیالات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔(اس سے قبل یہ مضمون ۱۹۴۰ء میں مجلّہ عثمانیہ کے مہاراجہ نمبر ''اقبال اور شاد کی مراسلت'' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔) یہ کتاب ۴۰+ ۱۷۶=۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔زور نے مقدمے کے بعد شاد اور اقبال کی تصاویر اور دونوں کے ایک ایک خط کا عکسی نمونہ بھی درج کیا ہے۔اس کے بعد خطوط کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۱۶ء، دوسرا ۱۹۱۷ء، تیسرا ۱۹۱۸ء، چوتھا ۱۹۱۹ء، پانچواں ۱۹۲۲ء، چھٹا ۱۹۲۳ء اور ساتواں ۱۹۲۷ء۔۱۹۲۴ء میں لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔زور نے یہ خطوط مہاراجہ کشن پرشاد کی وفات سے دو تین سال قبل اشاعت کی غرض سے حاصل کر لیے تھے ۔[۳] خطوط کا یہ مجموعہ سلسلہ مطبوعات ادارہ ء ادبیات اردو شمارہ ۸۶ کے طور پر شائع ہوا۔اس مجموعہ ء مکاتیب کو اقبال کے خطوط کے حوالے سے اولیت کا اعزاز حاصل ہے۔''شاد اقبال'' کی اشاعت کے بعد یکے بعد دیگرے اقبال کے مکاتیب کے مجموعے شائع ہونے شروع ہو گئے۔ ان مجموعوں میں ''اقبال کے خطوط جناح کے نام ۱۹۴۲ء'' ،اقبال نامہ جلد اول ۱۹۴۵ء ،جلد دوم ۱۹۵۱ء ، ''مکاتیب اقبال بنام محمد نیاز الدین خان مرحوم ۱۹۵۴ء ، ''اقبال ۱۹۵۶ء''، ''مکتوبات اقبال بنام نذیر نیازی ۱۹۵۷ء''، ''انوارِ اقبال ۱۹۶۷ء ، '' Letters and writings of

Iqbal ۱۹۶۷ء‘‘ ’’مکاتیب اقبال بنام گرامی ۱۹۶۹ء ،اہمیت کے حامل ہیں۔ اقبال کے تمام مکاتیب کو مظفر حسین برنی نے اکٹھا کر کے کلیاتِ مکاتیب اقبال کے نام سے شائع کر دیا۔ پہلی جلد میں ۱۹۱۸ء تک، دوسری جلد میں ۱۹۲۸ء تک، تیسری جلد میں ۱۹۳۴ء تک، چوتھی جلد میں ۱۹۳۸ء تک اور پانچویں جلد میں انگریزی خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔[۴]

سید محی الدین قادری زور کے مرتبہ مجموعہء مکاتیب ’’شاد اقبال‘‘ میں شامل خطوط کو شیخ عبداللہ نے ’’اقبال نامہ حصہ دوم‘‘ میں شامل کیا۔[۵] جون ۱۹۸۶ء میں محمد عبداللہ قریشی نے اقبال اور شاد کے تمام دستیاب خطوط اکھٹے کر کے سنین وار ’’اقبال بنام شاد‘‘ کے نام سے شائع کر دیے۔اس مجموعہ کے سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے’’ اقبال بنام شاد،اس مجموعے میں ’’شاد اقبال‘‘ والی مراسلت بھی شامل ہے۔‘‘ یہ کتاب پہلی بار بزم اقبال لاہور سے جون ۱۹۸۶ء میں ۱۱۰۰ کی تعداد میں شائع ہوئی۔ آغاز میں محمد عبداللہ قریشی نے ۵۸ صفحات کا ضخیم مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ جس میں شاد کے حالاتِ زندگی،علمی و ادبی مشاغل،شاد اوراقبال کے تعلقات اوراقبال کے حیدرآباد سے تعلق پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد اقبال کے خطوط سنین وار درج کیے ہیں۔ ہر خط کے بعد وضاحت طلب مقامات کے حواشی وتعلیقات درج کیے ہیں۔ اس مجموعہ میں اقبال کے ۹۹ خطوط اور شاد کے ۵۴ خطوط شامل ہیں۔ شاد کے خطوط میں تعلیقات درج نہیں البتہ حاشیے میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ شاد کے خط کے جواب میں اقبال نے کون سا خط تحریر کیا۔اس طرح شاد اور اقبال دونوں کے خطوط کو ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے بہت سے وضاحت طلب نکات کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ان خطوط کی ترتیب اقبال کے خطوط کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ اس لئے شاد کے بعض خطوط کے سنین کی تقدیم و تاخیر میں فرق آ گیا ہے۔

اس سے قبل محمد عبداللہ قریشی صحیفہ کے اقبال نمبر حصہ اول شمارہ ۶۵ ،اکتوبر ۱۹۷۳ء میں زور کے مرتبہ خطوط کو ’’نوادرِ اقبال(اقبال کے پچاس غیر مطبوعہ خطوط)‘‘ کے عنوان سے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر چکے تھے ۔عبداللہ قریشی کے قائم کردہ عنوان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا ان خطوط کی دریافت کا سہرا محمد عبداللہ قریشی کے سر بندھتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خطوط ۳۳ سال پیشتر سید محی الدین قادری زور شائع کر چکے تھے۔عبداللہ قریشی کے تحریر کردہ مقدمے کا آغاز بھی اس جملے سے ہوتا ہے۔’’اقبال کے غیر مطبوعہ خط پیش کرنے سے پہلے مکتوب الیہ کے بارے میں بتانا ضروری ہے کہ یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد کو دکن تو جانتا ہی تھا ،برطانوی ہند میں بھی ان کی شہرت کچھ کم نہ تھی۔‘‘[۶] مذکورہ بالا عنوان اور سطور میں بھی حقائق سے پردہ پوشی کی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کے خطوط پہلی مرتبہ شائع ہو رہے ہیں۔ حالاں کہ اس مضمون سے کہیں پہلے سید محی الدین قادری زور’’شاد اقبال‘‘ کے نام سے ان خطوط کو شائع کر چکے تھے۔ اگرچہ محمد عبداللہ قریشی نے اس مضمون کے آخری صفحات میں نشان دہی کی ہے کہ’’علامہ اقبال اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کی مراسلت ۱۹۴۲ء میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے’’شاد اقبال‘‘ نے نام سے شائع کی تھی۔ اس مجموعے میں اقبال کے ۴۹ خطوط اور شاد کے ۵۲ خطوط شامل تھے۔[۷] لیکن مضمون کے عنوان اور ابتدائی سطور میں وہ اس حقیقت پر لاعلمی کا پردہ ڈال گئے۔انھوں نے آخری صفحات میں نشان دہی تو کی لیکن ابہام پھر بھی برقرار رکھا۔ انھیں چاہیے تھا کہ واضح اور دوٹوک انداز میں وہ یہ بتاتے کہ یہ وہی خطوط ہیں جنھیں زور پہلے شائع کر چکے ہیں۔عبداللہ قریشی کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ انھوں نے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت لی بھی ہے یا نہیں۔ مزید یہ کہ انھیں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھانا چاہیے تھا کہ انھوں نے صرف مقدمہ تحریر کیا ہے اور خطوط میں موجود وضاحت طلب مقامات کے اندھیروں کو تعلیقات کی روشنی سے منور کرنے کی کوشش کی ہے۔ فقط یہی ان کا حصہ ہے۔ انھی خطوط کو محمد عبداللہ قریشی نے اقبال اور

شاد کے مزید حاصل شدہ خطوط کے ساتھ ''اقبال بنام شاد'' میں شائع کر دیا۔اس کتاب کے سرِ ورق پر صرف یہ تحریر کیا کہ اس میں ''شاد اقبال والی مراسلت بھی شامل ہے''۔ سرِ ورق کے عنوان سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ ''شاد اقبال'' کی مراسلت سے کیا مراد ہے۔محمد عبداللہ قریشی نے صحیفہ میں شامل مضمون میں صرف اقبال کے خطوط شائع کیے تھے اور اس کتاب (اقبال بنام شاد) میں اقبال اور شاد کے وہ تمام خطوط بھی شامل کر دیے جو محی الدین قادری زور کی مرتبہ ''شاد اقبال'' میں شامل تھے۔بغیر اجازت کسی دوسرے کے مال پر ہاتھ صاف کرنا تحقیقی بدیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔محمد عبداللہ قریشی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ان کو چاہیے تھا کہ وہ واضح اور دوٹوک انداز میں نشان دہی کرتے کہ محی الدین قادری زور کے مرتبہ خطوط کو اقبال کے خطوط کی اشاعت کے حوالے سے اولیت حاصل ہے ۔محی الدین قادری زور نے ''شاد اقبال'' میں اقبال کے جو خطوط درج کیے ہیں ، ان کے علاہ خطوط کا حصول اور ان کی اشاعت محمد عبداللہ قریشی کا کارنامہ ہے۔زور نے ''شاد اقبال'' شائع کرنے سے پیشتر کافی کوشش کی تھی کہ اقبال کے بقیہ خطوط بھی دستیاب ہو جائیں لیکن انھیں ناکامی ہوئی۔ شاد کے نام ہزاروں خطوط میں سے باقی خطوط کو تلاش کرنا کافی دقت طلب کام تھا۔ اس جوئے شیر کو کھودنے کا کام عبداللہ قریشی نے کیا ۔ اس کے باوجود اقبال کے خطوط کی پہلی اشاعت زور کے ہاتھوں ہوئی ۔محمد عبداللہ قریشی کو عطاء اللہ مرتب' اقبال نامہ' کی تقلید کرتے ہوئے ان خطوط کی اشاعت کی زور سے اجازت بھی لینی چاہیے تھی۔شیخ عطاء اللہ نے ''اقبال نامہ''حصہ دوم شائع کیا تو اس میں شاد کے نام اقبال کے خطوط بھی شائع کیے لیکن اس سے پیشتر انھوں نے یہ عبارت نقل کی ہے۔

'' اقبال کے خطوط کے اولین مجموعہ کی اشاعت کا شرف وفخر جناب محی الدین صاحب قادری پروفیسر ادبِ اردو جامعہ عثمانیہ کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ انھوں نے' اقبال نامہ'یعنی پیشِ نظر مجموعہ کی جلد اول کی اشاعت سے قبل 'شاد اقبال' کے نام سے اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد (حیدرآباد) کی باہمی خط وکتابت جو متعدد اعتبارات سے اہم ہے ،شائع کر دی ہے۔ میں جملہ عقیدت مندانِ اقبال کی طرف سے ان کی خدمت میں دلی تشکر کا ہدیہ پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے 'شاد اقبال' کے اس انتخاب کی 'اقبال نامہ حصہ دوم' میں شمولیت کی بخوشی اجازت مرحمت فرمائی۔ قارئین کرام اور دوست دارانِ اقبال 'شاد اقبال' کے مطالعہ سے اقبال سے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔''[۸]

اگرچہ عبداللہ قریشی نے ان خطوط کو احتیاط سے نقل کیا ہے لیکن بعض مقامات پر پروف کی اغلاط راہ پا گئی ہیں۔ تین مقامات پر ان سے اقبال کے خطوط کی تاریخوں کے درج کرنے میں بھی تسامح ہوا ہے۔ جس سے محققینِ اقبال کو بعض نتائج اخذ کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے ۔اقبال پر درج غلط سنین کی وجہ سے محققینِ اقبال کو بعض نتائج کے استخراج میں دھوکہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عبداللہ قریشی نے ایک خط کی تاریخ یکم اکتوبر ۱۹۱۴ء درج کی ہے ۔جب کہ یہی خط 'شاد اقبال'ص ۳ پر یکم نومبر ۱۹۱۶ء کے تحت درج ہوا ہے۔ درست تاریخ بھی' شاد اقبال' میں درج تاریخ ہی ہے کیونکہ عبداللہ قریشی کے مذکورہ خط سے پہلے ۲ ستمبر ۱۹۱۶ء کا اور مذکورہ بالا خط کے بعد ۳۱،اکتوبر ۱۹۱۶ء کا خط درج ہوا ہے۔ ۱۹۱۶ء کے سال کے خطوط میں ۱۹۱۴ء کا خط درج نہیں ہو سکتا۔ اس لیے عبداللہ قریشی کی درج تاریخ درست نہیں۔ اسی طرح ص ۲۰۲ پر ایک خط کی تاریخ ۲۲ فروری ۱۹۱۷ء درج ہے جب کہ زور نے' شاد اقبال' ص ۲۹ پر اسی خط کی تاریخ ۲۳ فروری ۱۹۱۷ء درج کی ہے۔' اقبال بنام شاد' ص ۲۳۹ پر ایک خط کی تاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۷ء درج ہوئی ہے جب کہ 'شاد اقبال'ص ۶۹ پر اسی خط کی تاریخ ۱۹ دسمبر ۱۷ درج ہے۔ ان اغلاط سے یہ محسوس ہوتا ہے

کہ خطوط کو مرتب کرتے ہوئے زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ عبداللہ قریشی نے کسی مقام پر یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے 'شاد اقبال' والی مراسلت کو اصل خطوط سے نقل کیا ہے یا 'شاد اقبال' سے۔ راقم السطور کا خیال ہے کہ انھوں نے اصل خطوط نہیں دیکھے بلکہ 'شاد اقبال' سے خطوط نقل کیے ہیں اور خطوط نقل کرنے میں تسامحات سے دامن نہ بچا سکے۔ ''اقبال بنام شاد'' کے متن کا ''شاد اقبال'' کے متن سے موازنہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر کتاب میں بعض متنی اغلاط بھی راہ پا گئی ہیں۔ اسی طرح جب ''اقبال بنام شاد'' کا موازنہ شیخ عطاء اللہ کے ''اقبال نامہ'' میں موجود اقبال کے خطوط سے موازنہ کیا گیا تو ان میں متنی اغلاط مذکورہ تصنیف سے زیادہ نظر آئیں۔ ''اقبال نامہ'' کا اولین ایڈیشن پیشِ نظر نہیں اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اغلاط اقبال اکیڈمی کی مرتبہ ''اقبال نامہ'' میں راہ پا گئی ہیں کہ اس کے نقل کرنے میں شیخ عطاء اللہ سے تسامح ہوا۔

دکن کئی سو سال تک علم، ادب اور تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ دکن کی تہذیب و تمدن کی تعمیر میں سلاطینِ بہمنیہ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے پونے دو سو سال (۱۵۲۵۔۱۳۵۰ء) حکومت کی۔ بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد دکن پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جس میں گول کنڈا اور بیجا پور وہ سلطنتیں تھیں جنھوں نے اردو زبان، ادب، مذہب اور تاریخ کے حوالے سے گراں قدر کارنامے سرانجام دیے۔ گول کنڈا کے سلاطین قطب شاہی اور بیجا پور کے سلاطین عادل شاہ کہلاتے تھے۔ قطب شاہ اور عادل شاہ شعر و ادب سے دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ اورنگزیب عالمگیر نے دکن کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا لیکن جیسے ہی عالمگیر کا انتقال ہوا تو ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح دکن نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں حیدرآباد مشرقی تہذیب و اقدار کا سب سے بڑا مرکز بن کر ابھرا۔ وہاں کے لوگوں کا طرز معاشرت ہی مشرقی نہ تھا بلکہ ان کا اندازِ فکر اور فلسفہء زیست بھی مشرقی تھا۔[9] بیسویں صدی میں حیدرآباد دوسری ریاستوں کی مانند قرونِ وسطیٰ کے عہد زریں کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ برطانوی ہند میں جو سماجی، سیاسی اور ادبی تحریکیں اٹھتی تھی ان کی گونج حیدرآباد میں بھی سنائی دیتی تھی۔[10] مملکت حیدرآباد پر خاندانِ آصفی کا پرچم ۲۳۵ سال تک اپنی شان و شوکت سے لہراتا رہا۔ اس دوران دس حکمران تخت نشین ہوئے۔ دس کے دس نظام کہلائے مگر آصف کے خطاب سے صرف سات مخاطب ہوئے۔ آخری حکمران میر عثمان علی خان تھے۔ انھیں جامعہ عثمانیہ کی طرف سے سلطان العلوم کا خطاب بھی دیا گیا۔ میر عثمان علی خان شاعر بھی تھے اور عثمان تخلص کرتے تھے۔ شاہانِ دکن کا طویل ترین دورِ حکومت نظامِ نہم میر محبوب علی خان کا چھیالیس برس پر محیط تھا۔ انھیں نظام اول آصف جاہ اول کے بعد سب سے زیادہ احترام اور عقیدت سے یاد کیا جاتا تھا۔ آخری حکمران میر عثمان علی خان حیدرآباد کی علمی، ادبی، معاشرتی، معاشی، صنعتی، زرعی زندگی میں انقلاب بھی لائے۔ تخت نشینی کے بعد نواب سالار جنگ کو مدارالمہام بنایا مگر پھر جلد ہی انھیں سبک دوش کر دیا۔ بابِ حکومت کے قیام کے بعد انتظامیہ کا سربراہ صدراعظم کہلانے لگا۔ کئی شخصیتیں صدر اعظم ہوئیں۔ سر امام علی، سرفریدوں الملک، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری، نواب آف چھتاری، سرمرزا اسماعیل اور میر لائق علی اس عہدے پر سرفراز رہے۔[11]

علامہ اقبال کو دکن سے بڑی الفت تھی ۔ وہ حیدرآباد کو اسلامی ریاست تصور کرتے تھے اور نظام کی بھی عزت کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے دو مرتبہ حیدرآباد دکن کا سفر کیا تھا۔ پہلی بار مارچ ۱۹۱۰ء میں اور دوسری بار جنوری ۱۹۲۹ء میں ۔ پہلے سفر کے وقت سر اکبر حیدری نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ اس سفر کی یادگار نظمیں 'شکریہ' اور 'گورستانِ شاہی' ہیں۔ دوسری مرتبہ انیس سال بعد ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد گئے۔ اس مرتبہ اہلِ مدراس نے اسلامیات پر لیکچرز کے لیے انھیں مدعو کیا تھا۔ اس موقع سے

فائدہ اٹھاتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور طلبا کی انجمنوں نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی چنانچہ اقبال مدراس سے واپسی پر حیدرآباد گئے اور وہاں ۱۵ تا ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو فلسفہء اسلام پر تین لیکچر دیے۔[۱۲] اس موقع پر ان کی ملاقات نظام حیدرآباد سے بھی ہوئی۔نظر حیدرآبادی نے اس موقع کے حوالے سے لکھا ہے کہ اقبال نے نظام کی خدمت میں فارسی اشعار بھی سنائے تھے جو انھی کے لیے کہے گئے تھے۔[۱۳] احتسین سروری نے نظر حیدرآبادی کے اس بیان کو درست قرار نہیں دیا۔[۱۴] علامہ اقبال حیدرآباد کی خدمت کے لیے ہمیشہ آرزومند رہے لیکن انھیں کبھی اس کا موقع نہ ملا۔کئی بار افواہیں اڑیں کہ اقبال حیدرآباد کے چیف جسٹس مقرر ہو گئے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں لیکن یہ افواہیں کبھی حقیقت کا روپ نہ بن سکیں اور اقبال یہ حسرت دل میں لیے دنیا سے کوچ کر گئے ۔ حیدرآباد کے لوگوں کو بھی علامہ اقبال کی ذات اور شاعری سے والہانہ محبت تھی۔ بالِ جبریل کے جتنے نسخے وہاں فروخت ہوئے کسی شہر میں فروخت نہ ہوئے ہو گے۔[۱۵]

حیدرآباد میں اقبال کے عقیدت مندوں اور نیازمندوں کی تعداد کا تو اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی البتہ حیدرآباد کے مشہور اور معروف ہستیوں میں مہاراجہ سرکشن پرشاد، سر اکبر حیدری، مولوی عبدالحق، مسز سروجنی نائیڈو، بہادر یار جنگ، ڈاکٹر عباس علی خان لمعہ، نصیرالدین ہاشمی، مسز صغرا ہمایوں ، پروفیسر الیاس برنی، تمکین کاظمی اور تصدق حسین تاج اہمیت کے حامل ہیں۔ان سے اقبال کا تعلق رہا۔ان کے نام اقبال کے خطوط بھی اقبال کے مکتوبات میں موجود ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد حیدرآباد کی مقبول ترین شخصیت تھے۔ ہندوؤں میں ہندو، مسلمانوں میں مسلمان، شاعر، صوفی، سخی، ادب دوست، علم نواز، ملک و مالک کے وفادار اور مغل تہذیب کا آخری نمونہ۔عوام میں سخی داتا اور بچوں والے داتا مشہور تھے۔[۱۶] مہاراجہ کشن پرشاد آصف جاہی حکومت کے وزیراعظم تھے۔وہ کم وبیش گیارہ سال حیدرآباد کی وزارت پر فائز رہے۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر اور ممتاز نثر نگار بھی تھے۔شاد تخلص کرتے تھے۔انھوں نے چھوٹی بڑی کم وبیش ۷۶ کتابیں تصنیف کیں۔ان کی اہم تصانیف میں 'لطائف بے نظیر'، 'باغ بہار عجیب'، 'سرمایہء سعادت'، 'ارض الرمل'، 'فسانہء شہدا'، ''بزم عشاق'، 'باغِ شاد'، 'گلبنِ تاریخ'، 'روضہ شریف'، 'نذرشاد'، 'نسیم سحر'، 'صبح امید'، 'سیرِ پنجاب'، 'شکار شیر شاہی'، 'سپاس نامہ'، 'مطلع خورشید'، 'سفر دوہفتہ'، 'ارمغان وزارت'، 'جامِ جہاں نماں'، 'مخزن القوانی'، 'بیاضِ شاد'، ' مجموعہء مناجات'، 'مثنوی سرِ وجود'، 'مثنوی آئنہ ء وحدتِ وجود'، 'مخزن القوانی '، 'رقعاتِ شاد'، 'ترانہء شاد'، 'نسیم سحر'، 'شگوفہء بہار'، 'باغِ شاد'، 'نغمہء شاد'، 'رباعیاتِ شاد'، 'خدماتِ شاد'، 'نورِ چشم'۔'قومی لیڈر'، 'ماتم حسین' اور 'دینِ حسین' نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔[۱۷] ان کی سرپرستی میں 'تزکِ عثمانیہ'، 'دبدبہء آصفی' اور 'محبوب الکلام' رسائل بھی نکلتے تھے۔ دونوں رسائل مہاراجہ اپنے ذاتی خرچ سے نکالتے تھے۔مزاج کے اعتبار سے وہ ایک صوفی تھے جو بیسیوں شعرا، ادبا، علما اور دانشوروں کے سرپرست بھی تھے۔ ان کی نشست گاہ معروف اور غیر معروف واعظوں ،خطابوں ،مصوروں ،علم موسیقی کے ماہروں اور نجومیوں سے بھری رہتی تھی وہیں ہمیں اردو اور فارسی ادب کی بہت سی تاریخی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں۔مثلاً اردو کے نثر نگاروں میں سرشار، خواجہ حسن نظامی، عبدالماجد دریاآبادی، عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق، پنڈت دتاتریہ کیفی، نیاز فتح پوری، فرحت اللہ بیگ اور قاضی عبدالغفار سے ذاتی مراسم تھے۔ اردو شاعروں میں داغ دہلوی ، امیر مینائی، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، نظم طباطبائی، ظہیر دہلوی اور ماہرالقادری، وغیرہ کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔تاہم اقبال سے شاد کے مراسم کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ اقبال ان کے بعض اہم معاملات میں رازداں اور مشیر بھی ہیں اور ادب وشعر کے سلسلے میں رہنما اور استاد بھی۔[۱۸]

مہاراجہ کشن پرشاد سے اقبال کی پہلی ملاقات مارچ ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔[۱۹] باہمی خطوط کا آغاز یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء سے ہوتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد سے اقبال کا تقریباً دو دہائی سے زائد عرصے پر مشتمل خط و کتابت اور ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔آغاز میں تعلقات کی نوعیت خاص نہ تھی لیکن رفتہ رفتہ ان تعلقات میں رسوخ آتا گیا۔دونوں کے تعلقات اور مراسم اتنے گہرے ہو گئے کہ زور کو لکھنا پڑا ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی اور صداقت و محبت کا یہی جوش دونوں کے درمیان آخر تک رہا۔''[۲۰] دونوں فریق ایک دوسرے کو باقاعدگی سے خطوط لکھتے رہے۔ ان کے یہ خطوط ایک طرف ادبی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل ہیں تو دوسری طرف ان خطوط سے اقبال اور شاد کے نجی معمولات اور معلومات کا پتا بھی چلتا ہے۔ ان خطوط میں اقبال ایک نیاز مند یا عقیدت مند کے طور پر ہی سامنے نہیں آتے بلکہ ایک دوست، استاد، شاعر، باپ ،عاشق اور سیاسی فہم و فراست رکھنے والے شخص کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں۔ ان تمام حیثیتوں میں سب سے اہم حیثیت ایک ایسے انسان کی ہے جو دردمند اور حساس دل رکھتا ہے۔ وہ شاد کے ذاتی اور نجی معاملات میں شریک بھی ہے اور انھیں اپنے معاملات میں شریکِ کار کرنے میں بھی کسی پس و پیش کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

جس طرح اقبال شاد کو اپنے نجی معاملات میں شریک کرتے ہیں اسی طرح شاد بھی اپنے خطوط میں اقبال سے اپنے نجی معاملات بے تکلف زیرِ بحث لاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حیدرآباد کی سیاست اور اس میں اپنی حیثیت بھی بے تکلفی سے بیان کر دیتے ہیں۔ جس سے ان کی سادگی اور اقبال سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''اگرچہ میں جس قدر مختار ہوں اس سے زیادہ مجبور ہوں۔ جس قدر آزاد ہوں اس سے زیادہ پابند۔ جس قدر بلند ہوں اس سے زیادہ پست۔'' (ص ۲۹۴)

''ہائے افسوس! یہ وردی والے جو صبغۃ اللہ کہلاتے ہیں اپنے رنگ سے کیوں بے رنگ ہو جاتے ہیں۔'' (ص ۲۹۸)

''پیارے اقبال! جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں وہ کہنا نہیں چاہتا اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہیں سکتا۔'' (ص ۳۸۲)

''پیارے اقبال! یہاں کی انقلابی رفتار اور تغیر پذیر طرزِ عمل امرا کو پامال کر رہی ہے۔اس قدر گھبرا گیا ہوں کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ بلدہ کو خیر باد کہہ کر سفر کروں مگر پابندیاں مانع ہیں۔'' (ص ۳۶۲)

مہاراجہ کشن پرشاد کے علامہ اقبال سے تعلقات کی نوعیت دوستانہ، مشفقانہ اور مربیانہ تھی۔ مہاراجہ کے نام خطوط میں اقبال ایک بشری صفات کے حامل شخص کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ان کے خطوط کی بعض عبارتوں سے گمان گزرتا ہے کہ اقبال ان کے سامنے زانوئے طلب تہہ کیے رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں ۔وہ لوگ جو حیدرآباد کی تہذیبی زندگی اور ان کے مظاہر سے واقف ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ اقبال کا رویہ عقیدت اور نیاز مندی کا ہے،غلامی کا نہیں۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو مہاراجہ کے اقبال کے نام خطوط اس کی تائید کرتے۔ مہاراجہ اقبال کو مائی ڈیئر اقبال ، پیارا قبال ، دوست اور بھیا کے ناموں سے یاد کرتے رہے اور خود کو فقیر شاد لکھتے رہے۔[۲۱]

اقبال کی دلی خواہش تھی کہ ان کی ملازمت کا سلسلہ حیدرآباد میں ہو جائے ۔ اس کے لیے ان کے رابطے حیدرآباد کی کئی شخصیات سے رہے۔ان شخصیات میں شاد اور سر اکبر حیدری معروف نام ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ زور وہ مہاراجہ کشن پرشاد پر

دیتے رہے۔ اقبال، شاد کے نام خطوط میں بار بار اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی حیدرآباد مستقل آمد کا کوئی وسیلہ بن جائے۔ اس کے لیے وہ بار بار شاد کو خطوط میں یاد دہانی کرواتے ہیں۔ ذیل کی چند عبارتیں ملاحظہ کیجیے:

''دل میں یہ ضرور ہے کہ اگر خدا کی نگاہِ انتخاب نے مجھے حیدرآباد کے لیے چنا ہے تو اتفاق سے یہ انتخاب میری مرضی کے بھی عین مطابق ہے۔ گویا بہ الفاظِ دیگر بندہ

وآقا کی رضا اس معاملے میں کلی طور پر ایک ہے۔'' (ص۲۲۳)

''میرا جذبِ دل تو بوڑھا ہو گیا ہے۔آپ کا جذبہ تو بفضلہٖ ابھی جوان ہے اور ہمیشہ رہے گا پھر کیوں اقبال کو وہاں نہیں کھینچ لیا جاتا؟'' (ص ۲۴۱)

''میرے مقدر کے دانوں کی آپ کو تلاش ہے تو ممکن ہے مل جائیں اگرچہ بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سرکار مدارالمہام ہوتے تو اس قدر جستجو گوارا کرنے کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔اگر زمانے نے مجھے آپ کے آستانے پر لا ڈالا تو میری عین سعادت مندی ہے۔ اس وقت دوستانہ و نیازمندانہ مہر و وفا کا ثبوت دے سکوں گا۔ (ص۲۴۴)

''بہت سی باتیں کہنے کی ہیں مگر کیا کروں آپ کو دکن نہیں چھوڑتا تو مجھے پنجاب کی زنجیر سے آزادی نہیں ملتی بہر حال جس حال میں ہوں خوش ہوں۔ مقدر سے زیادہ اور وقت سے پہلے نہیں مانگتا۔ وقت خود بخود مساعدت کرے گا اور مشیت تقدیر میں جو کچھ پوشیدہ ہے اسے آشکار کر دے گا۔ انتظار میں بھی ایک لطف ہے۔'' (ص ۱۴۸)

''دل تو ملاقات کے لیے تڑپتا ہے مگر حالات پر نہ شاد کو قدرت ہے نہ اقبال کو۔امور کے فیصلے آسمان پر ہوتے ہیں۔ زمین پر محض ان کا اشتہار دیا جاتا ہے۔دیکھیں اس امر کے فیصلے کا اشتہار کب ہوتا ہے۔'' (ص ۲۴۸)

مندرجہ بالا اقتباسات میں موجود خط کشیدہ سطور سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ اقبال بڑی شدت سے خواہش رکھتے تھے کہ حیدرآباد میں ان کی ملازمت کا وسیلہ بن جائے لیکن بسیار کوشش کے باوجود انھیں حیدرآباد میں مستقل ملازمت کا کوئی باوقار موقع دستیاب نہ ہو سکا۔ عطیہ فیضی کو جب اقبال کی ان کوششوں کا علم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئیں۔ انھوں نے اقبال کو وہاں کی ملازمت حاصل کرنے سے سختی سے روکا تھا۔[۲۲]

ایک مرتبہ حیدرآباد ہائی کورٹ میں چیف جج کی خالی اسامی کے لیے نظام حیدرآباد کے پاس نام پیش ہوئے۔ان میں ایک نام اقبال کا بھی تھا۔اقبال کو علم ہوا تو انھوں نے اقبال نے مہاراجہ کو ایک تفصیلی خط تحریر کیا جس میں انھوں نے اپنا علمی تعارف تحریر کیا اور مہاراجہ سے سفارش کی بھی درخواست کی۔ان کا بیان ہے:

''ایک عریضہ اس سے پہلے بھی ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ امید ہے کہ پہنچ کر ملاحظہء عالی سے گزرا ہوگا۔'مخبرِ دکن' سے معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد ہائی کورٹ کی ججی کے لیے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔ اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے اور یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے۔ چند امور آپ کے گوش گزار کرنا ضروری خیال ہے۔جن کا علم ممکن ہے سرکار کو نہ ہو۔ممکن ہے کہ حضور نظام ان امور سے متعلق سرکار سے استفسار فرمائیں۔

اس جگہ کے لیے فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں ،تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ اس فن میں میں نے ہندوستان اور یورپ کے اعلیٰ ترین امتحان انگلستان(کیمرج) جرمنی(میونک)(کی) یونیورسٹیوں کے پاس کیے ہیں۔ انگلستان سے واپس آنے پر لاہور گورنمنٹ کالج میں مجھے فلسفے کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کام میں نے ۱۸ماہ تک کیا اور یہاں کی اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی۔ گورنمنٹ نے بعد ازاں یہ جگہ مجھے آفر بھی کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صبح کچہری نہ جا سکتا تھا۔ ججان ہائی کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں۔ چنانچہ ۱۸ ماہ تک اسی پر عمل درآمد ہوتا رہا مگر اس عہدے کے لیے جو حیدرآباد میں خالی ہوا ہے ،غالباً عربی دانی کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ اس کے متعلق یہ امر سرکار کے گوش کرنا ضروری ہے کہ عربی زبان کے امتحانات میں میں پنجاب میں اول رہا ہوں۔ انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ واپسی پر پنجاب اور الہٰ آباد یونیورسٹی کے ایم۔اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب میں بی۔اے کی فارسی کا ایک پرچہ اور ایم۔اے فلسفے کے دو پرچے میرے پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے میں نے پنجاب گورنمنٹ میں علمِ اقتصاد،تاریخ اور انگریزی بی ۔اے اور ایم۔اے کی جماعتوں کو پڑھائی ہے اور حکامِ بالا دست سے تحسین حاصل کی۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصے سے جاری ہے۔علم الاقتصاد پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی ۔انگریزی میں چھوٹی موٹی تصانیف کے علاوہ ایک مفصل رسالہ فلسفہء ایران پر بھی لکھا ہے جو انگلستان میں شائع ہوا تھا۔ ۔۔فقہ اسلام میں اس وقت ایک مفصل کتاب بہ زبانِ انگریزی زیرِ تصنیف ہے جس کے لیے میں نے مصروشام وعرب سے مسالہ جمع کیا ہے جو انشاء اللہ بہ شرطِ زندگی شائع ہو گی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو تفصیلِ مسائل کے اعتبار سے ایسا ہی بناؤں جیسی کہ امام نسفی کی 'مبسوط' ہے جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی تھی۔''(ص۲۲۷۔۲۲۵)

یہ اقبال کا وہ خط ہے جس میں انھوں نے اپنی علمی زندگی اور کارگزاریوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اسے اقبال کا تعلیمی تعارف(C.V) سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔اس خط میں اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کو اپنا علمی تعارف ہی نہیں کروایا بلکہ اپنا حقِ دوستی بھی طلب کیا ہے۔اقبال کو یہ معلوم تھا کہ جب ان کی عرضی نظام حیدرآباد کے پاس پیش ہو گی تو وہ مہاراجہ سے ضرور مشاورت کریں گے۔اس لیے اقبال نے مہاراجہ کو اپنا مکمل علمی تعارف لکھ بھیجا تا کہ ان کے ذہن نشین رہے اور موقع کی مناسبت سے وہ اسے نظام کے گوش گزار بھی کر سکیں۔ مزید یہ کہ اس خط سے اقبال کی علمی و ادبی زندگی کے حوالے سے اہم معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ یہ خط اقبال کی علمی زندگی کے حوالے سے بنیادی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ایک طرف اقبال حیدرآباد جانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے تو دوسری طرف قضاو قدر کا فیصلہ ان کی خواہش کے برخلاف آ رہا تھا۔ اقبال اپنی شہرت اور حیدرآباد کے عمائدین سے تعلقات کے باوجود حیدرآباد کیوں نہ جا سکے اس حوالے سے نظر حیدرآبادی اپنی تالیف ''اقبال اور حیدرآباد'' میں لکھتے ہیں۔

''قیاس یہ کہتا ہے کہ باخبر اور ہوشمند انگریز جس کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور پوشیدہ ہوتے تھے اور جس نے حیدرآباد

میں وقارالملک، محسن الملک، ظفر علی خان، عبدالحلیم شرر اور آخر میں علی امام کو ٹکنے نہ دیا تھا۔ وہ حیدرآباد میں اقبال جیسے ''خطرہ'' کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضور نظام سے لے کر ایک عام حیدرآبادی کی خواہش اور تمنا کے باوجود اقبال حیدرآباد میں مستقل قیام نہ کر سکے۔[۲۳]

مذکورہ بالا بیان اقبال کے حیدرآباد آمد میں بنیادی رکاوٹ پر روشنی ڈالتا ہے۔ البتہ مذکورہ بالا بیان میں نظر حیدرآبادی کا یہ بیان محلِ نظر ہے کہ نظام حیدرآباد کی بھی خواہش تھی کہ اقبال حیدرآباد میں مستقل قیام کریں۔اہلِ حیدرآباد اور اقبال کے بہی خواہوں کی خواہش تھی کہ وہ حیدرآباد میں آئیں اور ان کی ملازمت کا بھی وسیلہ بن جائے لیکن نظام حیدرآباد کی کبھی خواہش نہیں رہی کہ اقبال مستقل طور پر تو کجا عارضی طور پر بھی حیدرآباد آ کر رہائش پذیر ہوں۔

اس حوالے سے محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں۔''مہاراجہ سرکشن پرشاد اپنی پرخلوص محبت ،عقیدت اور ہمدردی کی بنا پر دل سے چاہتے تھے کہ اقبال ان کے قریب آجائیں اور ریاست میں انھیں کسی معزز عہدے پر فائز کر دیا جائے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی کونسل کی مخالفت اور ملکی اور غیرملکی عصبیت کی موجودگی میں اقبال کو اس میں کبھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ اول تو حکومتی سطح پر اقبال کی قدردانی کے لیے حالات پوری طرح سازگار نہیں تھے۔ دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اقبال آزاد خیال اور حریت پسند تھے انگریزی ملوکیت اور انگریزی تہذیب کی خرابیوں پر نہایت نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ دکن کے حکمران جو برطانیہ کی دوستی اور وفاداری کا دم بھرتے تھے، اسے انگریز کی نہیں اپنی مخالفت سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ اقبال کی سرپرستی کرنے سے کہیں ان پر کوئی آفت نہ آجائے۔ چنانچہ۱۹۳۲ء میں نواب حمیداللہ خاں والیِ بھوپال کو بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی سفارش کی تو نواب مہدی یار جنگ صدرالمہام سیاسیاتِ حیدرآباد دکن کی یہ رائے اس موقع پر قطعی اور حتمی صورت اختیار کر گئی کہ اقبال کی مالی امداد کے تعلق سے معذوری کا اظہار کر دیا جائے۔ چنانچہ نظام نے اسی پر عمل کیا۔۔۔مزید یہ کہ جب ۱۹۲۹ء میں اقبال نے جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر حیدرآباد کا دورہ کیا اور تین لیکچر دیے مہاراجہ سرکشن پرشاد نے مخالفتوں کے باوجود اپنے اختیارات سے انھیں سرکاری مہمان کی حیثیت سے سب سے اعلیٰ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا اور ٹاؤن ہال لیکچروں کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دی تو اس کو حیدرآباد کی سرکار انتظامیہ نے مخالفت بھی کی تھی اور اس حوالے سے مسائل بھی پیدا کیے تھے ۔خود نظام حیدرآباد نے دبے لفظوں میں ''بلاوسٹہ'' گیسٹ ہاؤس میں اقبال کے ٹھہرائے جانے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔[۲۴]

عبداللہ قریشی ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ''دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اقبال آزاد خیال اور حریت پسند تھے اور انگریزی ملوکیت اور انگریزی تہذیب کی خرابیوں پر نہایت نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ دکن کے حکمران جو برطانیہ کی دوستی اور وفاداری کا دم بھرتے تھے، اسے انگریز کی نہیں اپنی مخالفت سمجھتے تھے اورڈرتے تھے کہ اقبال کی سرپرستی کرنے سے کہیں ان پر کوئی آفت ہی نہ آجائے۔ چنانچہ۱۹۳۲ء میں نواب حمیداللہ خاں والیِ بھوپال نے اقبال کی مالی امداد کی تحریک چلا کر میر عثمان علی خاں کو بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی سفارش کی تو نواب مہدی یار جنگ صدرالمہام سیاسیاتِ حیدرآباد دکن کی یہ رائے اس موقع پر قطعی اور حتمی صورت اختیار کر گئی کہ اقبال کی مالی امداد کے تعلق سے معذوری کا اظہار کر دیا جائے۔ چنانچہ نظام نے اسی پر عمل کیا۔''[۲۵]

حیدرآباد کی سرزمیں عجیب قسم کی سرزمین تھی ۔یہاں ان لوگوں کے لیے راستے کھلے رہتے تھے جو اپنے خیالات اور طرزِ عمل

سے یہ ثابت کر دیتے تھے کہ ان کی حیدر آباد میں آمد نہ انگریزوں کے مفاد کے لیے خطرہ ہو گی اور نہ نظام حیدر آباد کے لیے مشکلات کا باعث۔ ایسے اشخاص کے لیے نظام کے دل کے ساتھ تجوریوں کے در بھی وا رہتے تھے لیکن جن لوگوں کے بارے میں نظام یا عمائدینِ ریاست دل صاف نہ رکھتے تھے ان کے قدم حیدر آباد میں نہ ٹک سکے۔ سبط حسن لکھتے ہیں۔ :

'' حیدر آباد کی سرزمین طالع آزماؤں کو اکثر راس آتی تھی۔ جو جاتا تھا فیض یاب ہوتا تھا۔ ملازمت ،وظیفہ یا نقد روپیہ کچھ نہ کچھ ضرور ہاتھ آجاتا تھا لیکن قسمت کی محرومی دیکھیے کہ بعض لوگوں کو دکن کے بحرِ سخاوت سے شبنم کے چند قطرے ہی ملے۔[۲۶] اقبال بھی ان میں سے ایک تھے۔

چونکہ اقبال انگریزوں کی نظر میں قابل اعتبار نہیں تھے اسی وجہ سے ان کے خطوط کھول کر پڑھے جاتے ہوں گے اور ان کے لوگوں سے تعلقات کی بھی نگرانی کی جاتی ہو گی۔ یہ بات مہاراجہ کشن پرشاد کے علم میں بھی ہو گی۔ اسی لیے جب اقبال نے اپنے ایک خط میں سیاسی خیالات کا اظہار کیا تو مہاراجہ نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں آئندہ ایسا نہ کرنے کی تنبیہ کی۔ مہاراجہ کے خط کے جواب میں اقبال لکھتے ہیں:

''میرے عریضے کا کچھ حصہ پولیٹیکل رنگ میں رنگین تھا تو اس میں تردد کی کوئی بات نہیں ۔آپ مطمئن رہیں۔ اقبال کبھی پولیٹیشین نہیں بنے گا۔ وہ تو ایک راز کی بات تھی جس کا کھل جانا یقینی۔ بہر حال آپ کا اصول بہتر ہے یعنی سکوت'' (ص۱۳۸)

اقبال کے حیدر آباد آنے میں سب سے بڑی رکاوٹ نظام حیدر آباد تھے۔ اقبال چاہتے تھے کہ کسی طرح نظام کو یہ باور کروا دیا جائے کہ اقبال کی حیدر آباد آمد ان کے لیے مسائل کا باعث نہ ہو گی۔ اس کے لیے انھیں خاص موقع کی تلاش تھی۔ جب یہ موقع دستیاب نہ ہو سکا تو انھوں نے شاد کو خط لکھا کہ''اس عریضے میں ایک تکلیف دیتا ہوں۔ غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں سے جو آپ کے تعلقات تھے ،ان کو تمام دنیا جانتی ہے۔ آپ کو ان کے بہت سے حالات معلوم ہوں گے۔ میری یہ خواہش ہے کہ ان کے عدل و انصاف کے متعلق کوئی نہایت دلچسپ اور معنی خیز واقعہ،جس کو بطور حکایت کے لکھ سکتے ہوں،بیان فرمایئے۔ میں اسے ایک خاص غرض کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں جو ایک وقت پر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ (ص۱۵۲)

مندرجہ بالا خط میں''خاص غرض کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں'' سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس واقعے کو نظام حیدر آباد کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ تا کہ ان کا راستہ حیدر آباد آنے کے لیے ہموار ہو سکے۔

غالب نے کہا تھا 'غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا'۔انسان اس دنیا میں کسی نہ کسی غم میں ضرور مبتلا رہتا ہے۔ اقبال کے ساتھ بھی اسی قسم کے مسائل اور غم لگے رہے۔ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ ان غموں سے چھٹکارا پاسکیں لیکن یہ غم ان کا پیچھا کہاں چھوڑتے ۔ اقبال کو بھی غمِ روزگار نے ساری عمر پریشان ہی رکھا۔ ان کی تمام عمر انھی غموں سے نبھا کرتے ہی گزری۔ شاد کے نام اکثر خطوط میں وہ اسی غم کا رونا روتے نظر آتے ہیں۔ کہیں وہ ملازمت کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں ذاتی زندگی کی مشکلات سے پردہ اٹھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں وہ آفتاب کو کسی پیرِ کامل کی مریدی میں دینے کی خواہش میں پریشان نظر آتے ہیں تو کہیں اسرارِ خودی کے اسرار و رموز سمجھاتے اور مخالفین کے جوابات دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں بھائی کی ملازمت کے لیے بھاگ دوڑ کرتے اور سفارش کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسروں کے لیے سفارشی رقعے تحریر کرتے

ہوئے تو کہیں خود کو سفارش کے لیے پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاد کے نام اکثر خطوط میں اقبال انھی الجھنوں کا شکار نظر آتے ہیں۔ ذیل میں اقبال کے خطوط سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

''قانونی مشاغل میں اشعار کے لیے کہاں سے وقت نکلے ''دل ودماغ'' دونوں کام کرنا چاہتے ہیں مگر ''پیٹ'' کا حکم ہے کہ ہماری رضا کے بغیر ایک خیال یا ایک تاثر اپنے اندر داخل نہ ہونے دو۔ عجب کشمکش کی حالت ہے''(ص۱۱۵)

'' آج کل شعر و شاعری کا شغل بھی کم ہے ۔''بھائی گدھا'' یعنی پیٹ دم بھر کے لیے مہلت نہیں دیتا۔ لاؤ چارا لاؤ چارا۔(ص۸۳)

''کئی مرتبہ ارادہ کرتا ہوں کہ پنجاب سے چند روز کے لیے نکل کر دکن کی سیر کروں مگر دکانداری کی زنجیریں پاؤں میں ہیں۔ دوچار روز کے لیے باہر نکلنے میں بھی اندیشہ ہے تو کجا پندرہ روز ،بیس روز یا ہمیشہ''(ص۱۵۲)

بعض اوقات اقبال اس دنیاداری اور معاشرتی علائق سے اتنا گھبرا جاتے ہیں کہ جی میں آتا ہے کہ وہ یہ سب پابندیاں چھوڑ کر کسی ایسی جگہ نکل جائیں جہاں یہ معاشرتی پابندیاں ان کی زندگی میں حائل نہ ہوں مگر پھر وہی پابندیاں سدِ راہ بن کر آ کھڑی ہوتی ہیں۔

''آپ سے ملنے کو دل بھی چاہتا ہے مگر کیا کروں، پابہ زنجیر ہوں ۔چند روز کے لیے بھی لاہور چھوڑنا محال۔کسی وقت اسی قسم کے مواقع کی وجہ سے اتنا گھبرا تا ہوں کہ بے اختیار موجودہ پیشے کی قیود کو توڑ تاڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں مگر وہی مثل ہے : چہ خورد بامداد فرزندم''(ص۱۶۳)

اقبال کے بڑے بھائی جن کی وہ والد کی طرح عزت کیا کرتے تھے۔ انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھجوانا بھی ان کی ہی وجہ سے ممکن ہوا۔ شیخ عطا محمد اقبال کے بڑے بھائی، محسن اور ہمدرد تھے۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اقبال ان کی ملازمت کے بندوبست کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''انھوں نے چیف انجینئر صاحب حیدر آباد اور میر کرامت اللہ خان صاحب سپرنٹنڈنٹ انجینئر کی خدمت میں درخواست ملازمت بھیجی ہے۔ میں نے ان کی فرمائش پر ہر قسم کی سفارش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر اس بارے میں آپ اپنا اثران کے لیے استعمال کریں تو میں نہایت ممنون ومشکور ہوں گا۔ مسٹر حیدری کو بھی میں نے ایک عریضہ اسی غرض سے لکھا ہے''(ص۱۸۰)

اس خط میں اقبال اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی سفارش ہی نہیں کرتے ،مہاراجہ کش پرشاد سے حقِ دوستی بھی طلب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مندرجہ بالا عبارت میں ''ہر قسم کی سفارش کرنے کا وعدہ' ' کے الفاظ میں اقبال کی کوششوں کی سمت کے تعین میں مدد ملتی ہے اور ماضی کے قرض چکانے کی یقین دہانی بھی۔[۲۷] اقبال نے شیخ عطا محمد کے علاوہ مولانا عبداللہ عمادی، مولوی سید ابراہیم[۲۸] اور شبیر حسن جوش ملیح آبادی[۲۹] کے لیے بھی شاد کو سفارش نامے تحریر کیے۔

آج کے عہد میں جب علم کاروبار بن چکا ہو۔ کتاب کی اشاعت مشکل ہو اور پبلشر کتاب کی اشاعت سے پہلے صاحبِ کتاب سے مالی معاونت کا طلب گار ہو تو زمانہء قدیم کے حوالے سے یہ کس طرح خوش گمانی کی جاسکتی ہے کہ اس وقت کتاب چھپوانا

آسان کام ہوگا۔ اردو کے بڑے بڑے ادیب اپنی علمی کارگزاریوں کو بوجھ اٹھائے پھرتے رہتے تھے لیکن ان کی اشاعت کا انتظام نہ ہو پاتا تھا۔ انیسویں صدی کے بڑے بڑے ادیبوں کی علمی فتوحات کی اشاعت کا انتظام نہ ہو پاتا۔ اگر ان ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت میں حیدرآباد، رام پور اور بھوپال جیسی ریاستوں کے نوابوں نے تعاون نہ کیا ہوتا۔ اقبال کی مندرجہ ذیل بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرارِ خودی کو اقبال نے اپنے ذاتی پیسے خرچ کر کے چھپوایا تھا۔ اس کتاب کو خوبصورت انداز میں چھپوانے کے لیے جتنے پیسے درکار تھے اتنے کی اقبال استطاعت نہیں رکھتا تھا یا ممکن ہے وہ اس کتاب کے دوسرے حصے کے لیے مہاراجہ سے مالی معاونت کے طلب گار رہوں جس کی درخواست وہ براہِ راست نہ کرنا چاہتے ہوں۔ ذیل کا بیان دیکھیے:

''اسرارِ خودی کی ایک کاپی ارسال خدمت کرتا ہوں۔ مجھے اس کتاب کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس وجہ سے کہ اس کی چھپائی وغیرہ کچھ دلکش نہیں مگر اس خیال سے کہ میں زیادہ روپیہ اس کی اشاعت پر خرچ کرنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ میری مجبوری کو ملحوظِ خاطر رکھ کر اس جرات کو معاف کریں گے۔ (ص ۱۴۱۔۱۴۰)

ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال انگریزی اصطلاحوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کمال صلاحیت رکھتے تھے۔ اگر وہ اردو زبان اور اس کی لسانی جہتوں پر کام کرتے تو وہ ایک یادگار کام ہوتا۔ مولوی عبدالحق نے نے انھیں اصطلاحاتِ علمیہ کے تراجم کی ایک فہرست ارسال کی تھی کہ وہ ان تراجم پر تنقید کریں تاکہ تصحیح کے بعد ان تراجم کو شائع کیا جا سکے۔[۳۰] یہ اصطلاحات ان خطوط میں کثیر تعداد میں تو نظر نہیں آتیں تاہم جہاں کہیں بھی نظر آتی ہیں ان سے اقبال کی اردو زبان پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''شخصی عنصر' سے مراد وہ اشعار ہیں جن میں مصنف کے ذاتی حالات واکتسابِ فیوض کا اشارہ ہے یا ذکر ہے۔ میں نے یہ لفظ خود وضع کیا تھا۔ اردو زبان میں مروج نہیں ہے۔ انگریزی میں اس مطلب کو اصطلاح Personal Element سے واضح کرتے ہیں۔'' (ص ۱۱۷)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''آج آٹھ دن سے مارشل لا یعنی قانونِ عسکری یہاں جاری ہے۔'' ص (۲۵۱)

مہاراجہ کے نام لکھے گئے اقبال کے اکثر خطوط بے تکلفانہ تحریر کیے گئے ہیں۔ ان میں ادبی چاشنی نہیں لیکن بعض مقامات پر اقبال کے اسلوب کی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے داد دینی پڑتی ہے۔ ان کا اسلوب ادبی انداز اختیار کر جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاعرانہ وسائل کو اپنی نثر میں استعمال کر رہے ہوں۔

''گو ہجومِ سفلی میں امید کی کمر شکستہ ہے تاہم جو کچھ بھی ہو سکے گا کروں گا۔'' (ص ۱۴۱)

''دونوں اشعار خوب ہیں۔ واللہ قبائے وزارت کے نیچے شاعری و درویشی، سپہ گری اور خدا جانے کیا کیا کمالات آپ نے چھپائے رکھے۔'' (ص ۷۵)

اگر اقبال اور شاد کے اسلوب کا موازنہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاد کا اسلوب اقبال کے اسلوب سے کہیں زیادہ علمی اور ادبی ہے۔ اقبال بے تکلفانہ لکھتے ہیں جس کی وجہ سے اقبال کی نثر میں وہ شعریت پیدا نہیں ہو سکی جو شاد کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ دو مثالیں دیکھیے:

''الغرض کل صوفیائے کرام کو انھوں نے کفر کی رسی میں لپیٹا ہے۔'' (ص ۳۲۸)

''اگست کو آج سے سات دن اور ستمبر کو ایک مہینہ سات دن باقی ہیں ۔میں آج ہی سے آپ کے انتظار کا احرام باندھتا ہوں۔'' (ص ۳۲۲)

اگرچہ مذکورہ بالا سطور میں اقبال اور شاد کی تحریروں سے مختصر جملے درج کیے گئے ہیں لیکن دونوں کے خطوط میں یہ تناسب ایک اور پانچ کا یا اس سے بھی زیادہ ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے ساتھ اقبال کا نیاز مندی کے علاوہ استادی کا رشتہ بھی تھا۔ اقبال وقتاً فوقتاً شاد کے کلام پر اصلاح دیتے رہتے تھے چونکہ شاد خود اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ اس لیے شاد کے نام اقبال کے خطوں میں اردو اور فارسی اشعار نظر آتے ہیں۔ دراصل اقبال شاد کے کلام پر اصلاحیں دیا کرتے تھے۔اقبال کی خواہش تھی کہ ان کے حیدرآباد میں آنے کا بندوبست ہو جائے تو پھر وہ اپنی صلاحیتیں پورے طور پر شاد کی خدمت میں صرف کر سکتے ہیں:

''باقی رہی اقبال کی بیرسٹری یا اور کوئی ہنر جو اس بے ہنر میں ہے، وہ سب آپ کی خدمت کے لیے وقف ہے ۔اگر یہ بندہء ناچیز وہاں قیام پذیر ہو گیا اور حالاتِ زمانہ نے مساعدت کی تو انشاء اللہ اقبال شاد کے کام آئے گا۔ (ص ۲۳۵)

مندرجہ بالاعبارت میں اقبال نے واضح انداز میں تو نہیں لیکن بین السطور یہ لکھا ہے کہ اگران کا حیدرآباد میں ملازمت کا انتظام ہو جائے تو سیاسی اور ادبی دونوں معاملات میں آپ سے بھرپور تعاون کر سکتا ہوں۔ شاد کو ۳۰ جون ۱۹۱۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''نوازش نامہ مل گیا ہے۔ فارسی مثنوی یا قصیدہ لکھا گیا ہے۔ میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ چوں کہ سرکار نے ترمیم وتنسیخ کے لیے ارشاد فرمایا تھا ،اس واسطے کسی کسی جگہ ترمیم کی جرات کی ہے۔ طوالت کے خیال سے وجوہِ ترمیم نہیں لکھے ۔ سرکار پر خود بخود روشن ہو جائے گا۔ چند اشعار کے گرد لکیر کھینچ دی ہے۔ ان کی اشاعت میرے خیال میں مناسب نہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ 'بردار تواں گفت و بہ منبر نہ تواں گفت' اور کچھ اس وجہ سے کہ آپ کی شانِ صداقت اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ آپ اپنی صفائی کے گواہ پیش کریں۔ اہلِ نظر کو یہ اشعار کھٹکیں گے۔ آئندہ سرکار کو اختیار ہے کہ ان کی اشاعت ہو یا نہ ہو۔ یہ اشعار صفحہ دس گیارہ پر ہیں۔ سرکار کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے تقریظ کے طور پر چند اشعار اس قصیدے کی پشت پر لکھ دیے ہیں۔ آخر کے شعر میں ایک مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کی تشریح اسی جگہ کر دی ہے۔'' (ص ۲۳۰۔۲۳۱)

شاد کے نام اقبال کے بہت سے خطوط دستیاب نہیں ہو سکے۔ممکن ہے انھیں تلف بھی کر دیا گیا ہو تا کہ بعض معاملات تاریخ کا حصہ نہ بن پائیں۔ اگر وہ خطوط دستیاب ہو جائیں تو بہت سے اسرار سے مزید پردہ اٹھ سکتا ہے۔ شاد اردو اور فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ غالباً انھوں نے اقبال سے اس خواہش کا اظہار کیا ہو گا کہ وہ شاعری کے لیے نئے اور عمدہ خیالات سے انھیں وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہا کریں تا کہ وہ ان خیالات کو اپنی شاعری کا حصہ بنا سکیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ شاد کے نام اکثر خطوط میں اردو اور فارسی کے اشعار اور مصرعوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ مذکورہ مؤقف کی تائید میں ۱۱مارچ ۱۹۱۵ء کے خط کی یہ سطور ملاحظہ کیجیے:

''کل میر رضی دانش کا ایک شعر پڑھا تھا۔ تنہا لطف نہیں آتا۔ آپ کو بھی سناتا ہوں ۔ اس پر غزل لکھیے:

زساقی بادہ می گیرم بپائے تاک می ریزم ندارم فکر خود میخانہ را آبادی سازم (ص ۱۲۰)

دوخطوں کی مزید عبارتیں ملاحظہ فرمائیے:

کل سے مومن استر آبادی کا یہ شعر پڑھ رہا ہوں ۔یقین جانیے کہ سینکڑوں دفعہ پڑھ چکا ہوں۔

اے کہ گوئی عشق را درمیانِ ہجراں کردہ اند کاش می گفتی کہ ہجراں را چہ درماں کردہ اند (ص ۱۳۳)

کیا دلکش اور معنی خیز شعر کسی ایرانی شاعر کا ہے۔

بزمے کہ درآں سفرہ کشد جلوہء دیدار کونیں غبارے ست کہ از بال مگس ریخت (ص ۲۲۵)

مندرجہ بالا اشعار بھی غالبًا اقبال نے اسی لیے تحریر کیے ہیں کہ شاد ان پر غزل کہہ سکیں۔ فی الوقت شاد کا سارا کلام پیشِ نظر نہیں اس لیے یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ انھوں نے ان اشعار پر غزلیں کہیں یا نہیں۔

بعض اوقات انسان کی ذہنی حالت پر انقباض کا ایسا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ نیا اور اچھوتا خیال تو کجا اچھا خیال بھی ذہن کے دریچوں سے گزر نہیں پاتا۔ ایسی صورت حال ہر شاعر اور ادیب پر طاری ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال اقبال پر بھی کئی مرتبہ طاری ہوئی ۔ انھوں نے اس کا ایک حل یہ نکالا تھا کہ وہ کسی اچھے شعر کو تلاش کریں اور ان سے لطف لیں تا کہ ان پر طاری کیفیت کو ختم کیا جاسکے۔ ایک خط میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں۔

''میں نے عرصہ سے کوئی شعر نہیں لکھا ۔فارسی کا کوئی نہایت شگفتہ مصرع لکھیے ۔شدید قبض کی حالت مبدل بہ بسط و انشراح ہو جائے۔''[۳۱]

مندرجہ بالا اشعار بھی ممکن ہے شاد کی ایسی کیفیات کے حل کے لیے پیش ہوئے ہوں۔

علامہ اقبال کے ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو لٹریچر کی روایت پر گہری نظر رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ آنے والا وقت دکنی لٹریچر کی دریافت اور ایڈیٹنگ کا ہوگا اسی لئے وہ مہاراجہ کشن پرشاد پر زور دیتے ہیں کہ وہ دکنی لٹریچر کی ایڈیٹنگ کا کام کریں۔ وہ محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' میں موجود دکنی لٹریچر کے حوالے سے آرا اور کام سے مطمئن نہ تھے۔ اسی لئے وہ بار بار مہاراجہ سے درخواست کرتے رہتے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ مہاراجہ اہلِ اقتدار میں سے تھے اس لئے قلمی مسودات تک رسائی اور ان سے استفادہ ان کے لئے ناممکن نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''آج کل سرکار کو فرصت ہے اور مہماتِ امور سلطنت سے سبکدوشی حاصل ہے ۔اگر طبیعت راغب ہو تو مرزا بیدل کا دیوان ایڈٹ کر ڈالیے۔ حیدر آباد کے کتب خانوں میں اس کے کامل نسخے ضرور موجود ہوں گے۔ فارسی میں آپ کی دسترس قابلِ رشک ہے۔ اگر یہ کام زیادہ توجہ اور محنت چاہتا ہو تو اس سے سہل تر کام بھی ہے۔ وہ یہ کہ ولی سے پہلے کے دکنی شعرا کا کلام شائع ہونا چاہیے، مثلاً سلطان قطب شاہ ۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے دیوان کا ایک نسخہ سرکار کے کتب کانے میں موجود ہے۔اردو لٹریچر پر یہ ایک بہت بڑا احسان ہوگا اور مولانا آزاد مرحوم کی تخلیق میں اضافہ۔'' (ص ۱۵۷)

''ولی دکنی سے پہلے کے اردو شعرا کو ایڈٹ کرنا نہایت مفید ہوگا اور اردو لٹریچر ہمیشہ کے لیے آپ کا زیرِ بار احسان رہے گا۔''
(ص ۱۵۹)

اگرچہ مہاراجہ اقبال کے مشوروں پر عمل نہ کر سکے لیکن آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ دکنی لٹریچر پر کام وقت کی ضرورت بھی تھا اور اہم بھی ۔اسی وجہ سے محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، نصیرالدین ہاشمی اور دوسرے دکنی محققین نے دکنی لٹریچر کو قعرِ گمنامی سے نکال کر عوام سے روشناس کروایا۔

اقبال کے خطوط میں ان کی گھریلو زندگی سے متعلق بھی کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اقبال اپنے بڑے بیٹے آفتاب کے حوالے سے ساری عمر پریشان رہے۔

آفتاب کی خودسری اور دوسری حرکتوں کی وجہ سے انھیں ایک پل چین نہ آتا تھا۔ شاد کے نام ایک خط میں بھی وہ آفتاب کے حوالے سے پریشان نظر آتے ہیں۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ اسے کہیں مرید کروا دوں یا شادی کر دوں تا کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔[۳۲] ان خطوط میں اقبال کی بیوی کے انتقال اور دوسری بیوی سے بیٹے کے پیدا ہونے کی خبر بھی ملتی ہے۔[۳۳] ۱۱نومبر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی والدہ کا انتقال ۹نومبر کو ہوا تھا۔[۳۴] اقبال کے اسفار، حالات، سیاسی خیالات، پیش گوئیاں، اس طرح کی خبروں سے اقبال کی زندگی سے متعلق مستند معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

سلطنت آصفیہ میں شعرا کی سرپرستی سلاطینِ آصفیہ ہی نہیں کر رہے تھے ،امرا، وزرا اور عمائدینِ سلطنت بھی اس میں پیش پیش تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں حیدرآباد میں اورنگ آباد، برہان پور اور شمالی ہند سے آئے ہوئے شعرا کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے شعروسخن کا ماحول خاصا گرم ہو گیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں نئے شعرا کو اپنی جگہ بنانے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس عہد میں شعرا کے لیے کسی ایک صنف کا سہارا ہی کافی نہ تھا۔ کئی کئی اصناف میں تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کو آزمایا جاتا تھا۔ اس طرح سلاطین آصفیہ کے مزاج کو دیکھتے ہوئے شعرا تاریخ گوئی میں اپنے فن کے نمونے پیش کر رہے تھے اور قابلِ قدر شعرا کی صف کو محدود کر رہے تھے۔ اس عہد کے تاریخ گو شعرا میں میر شمس الدین فیضؔ، عزیز اللہ ہمرنگؔ، شیخ خواجہ غلام احمد، احمد علی عصر، منشی عبد الصمد صمد، قادر حسین نسق، میر کاظم علی خان شعلہ، غلام محی الدین خان متین، یعقوب علی یعقوب، موسیٰ رضا رضاؔ، نوازش علی خان شیدا، عبدالکریم والہ، محمد فیاض الدین خان فیاض، عزیز یار جنگ وِلا، کریم، شور، سیف، مرزا عزیز بیگ عزیز، نظام الدین احمد نظام، عبدالرحمٰن خان ساجد، شاہ فیض اللہ تحمل، میر مصطفےٰ علی اسد، خواجہ سمیع اللہ نام، مرزا رسول بیگ کرم، خواجہ بدیع اللہ قیس، محمد مظفر الدین خان مزاج، محشری اور امیر مینائی وغیرہ قابل ذکر شعرا ہیں۔ داغ کو بھی اپنی جگہ بنانے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بیسویں صدی میں بھی صورتِ حال اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ ایسی صورتِ حال میں اقبال کو بھی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی کہ وہ اس فن میں اپنی مشق کو بہتر بنائیں اور اس فن میں اپنی صلاحیت کا اظہار بھی کریں چنانچہ شاد کے نام خطوط میں اقبال نے اس فن کے اظہار کے راستے تلاش کیے اور بین السطور یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ خود بھی تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور مادہء تاریخ نکالنے اور اس فن کے مختلف مظاہر پر قدرت رکھتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''خواجہ حسن نظامی نے آپ کا نام 'خماری شاہ' رکھا تھا۔ آپ کے مناسبِ حال ہے مگر میں آپ کو 'جلال بخاری' کہتا ہوں کہ

کشن پرشاد' کا ہم عدد ہے۔'' (۱۳۲)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:''زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ خدائے قادر و قیوم نے 'کشن پرشاد' کو 'ذوالمنن' کا ہم عدد کیا ہے۔ اقبال پر بھی نظرِ عنایت رہے اور اوقاتِ خاص میں اس شرمندہء عقبیٰ کو یاد رکھا جائے۔'' (ص ۱۹۸)

اول الذکر خط میں اقبال نے کشن پرشاد اور جلال بخاری کے اعداد میں یکسانیت تلاش کر کے ایک نکتہ پیدا کیا ہے۔ دونوں کے اعداد ۸۷۷ بنتے ہیں۔ دوسرے خط میں بھی 'کشن پرشاد' اور ذوالمنن کے اعداد میں یکسانیت تلاش کر کے مدعا پیش کیا ہے۔ اسی طرح انھیں کسی اخبار سے یہ اطلاع ملی کی شاد کو دوبارہ وزیراعظم کے عہدے پر تقرر ہو گیا ہے۔انھوں نے بغیر کسی سے تصدیق کیے ۔اس واقعے کا یہ قطعہء تاریخ لکھ کر بھیج دیا۔

صدرِاعظم گشت شادِنکتہ سنج　　ناوکِ او دشمناں را سینہ سفت

سالِ ایں معنی سروشِ غیب داں　　جانِ سلطاں سرکشن پرشاد گفت

۱۳۴۱ھ (ص۲۶۹)

۱۹۱۵ء میں اقبال کی فارسی مثنوی 'اسرارِ خودی' شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں اقبال نے حافظ شیرازی کے اندازِ فکر کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور اسے گوسفند کہتے ہوئے 'حافظِ صہبا گسار' سے ہوشیار رہنے اور 'محفلِ حافظ' سے بے نیاز رہنے کی تلقین کی تھی۔ اس مثنوی میں اقبال نے 'چشمِ حافظ' کو 'غارت گر شہر' بھی کہا تھا۔ اسی طرح اس مثنوی کے دیباچے میں بھی سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ حافظ شیرازی کو ہندوستان کا صوفی طبقہ بڑے احترا م کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔اقبال کے ان خیالات کی وجہ سے کئی مشائخ اور اربابِ ذوق اقبال سے ناراض ہو گئے اور مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ اقبال نے مثنوی کی دوسری اشاعت میں قابلِ اعتراض اشعار اور مواد کو مثنوی سے خارج کر کے اس بحث کو منطقی انجام تک پہنچا دیا۔ [۳۵] شاد کے نام خطوط میں اقبال نے بڑی تفصیل سے خودی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان خطوط کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے گویا یہ خطوط نہیں مختصر مقالے ہیں۔ ان خطوط میں اقبال نے جس تفصیل سے خودی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ،اتنا شاید کسی اور کے نام خطوط میں نہیں کیا۔ ان خطوط سے اقبال کے تصورِ خودی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اقبال کے تصورات پیش کرنے کے محرکات پر بھی ۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

'' یہ مثنوی جس کا نام 'اسرارِ خودی' ہے ، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی، بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا ،میری روح کو چین نہیں آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد ہی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہو گی کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر واجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ و ہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے ۔مگر ع ''من صدائے شاعرِ فرداستم'' اور

؎ نا امید ستم زیارانِ قدیم　　　طورِ من سوز د کہ می آید کلیم

نہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال ۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا ،ضرور اُگے گا اور علی الرغمِ مخالفت بارآور ہو گا۔ مجھ سے ان کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔'' (ص ۱۶۴۔۱۶۳)

''خواجہ حسن نظامی صاحب نے تنقیدِ حافظ کی وجہ سے اس مثنوی کو مخالفِ تصوف سمجھا ہے اور اسی مفروضے پر ان کے مضامین کا دارومدار ہے، جن میں مجھے انھوں نے دشمنِ تصوف کہہ کر بدنام کیا ہے۔ ان کو تصوف کے لٹریچر کی واقفیت نہیں اور جس تصوف پر وہ قائم ہیں، اس کا میں مخالف نہیں۔ہاں اس کے بعض مسائل کو میں صحیح تسلیم نہیں کرتا اور جس مسئلے میں میں نے اختلاف کیا ہے ، مجھ سے پہلے ہزاروں صوفی اس سے اختلاف کر چکے ہیں۔خواجہ حافظ کی شاعری کا میں معترف ہوں ۔میرا عقیدہ ہے کہ ویسا شاعر ایشیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا اور غالباً پیدا بھی نہ ہو گا لیکن جس کیفیت کو وہ پڑھنے والے کے دل پر پیدا کرنا چاہتے ہیں ،وہ کیفیت قوائے حیات کی کمزور و ناتواں کرنے والی ہے۔ ۔۔میں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی گزشتہ دماغی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا ہے، جس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان دنوں قوموں کے اطبا کو اپنے اپنے مریض کا اصلی مرض اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصلی مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے، اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے، جو ایشیا کی بعض قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا۔ جس نکتہء خیال سے یہ قومیں زندگی پر نگاہ ڈالتی ہیں، وہ نکتہء خیال صدیوں کے مضعف مگر حسین و جمیل ادبیات سے محکم ہو چکا ہے اور اب حالاتِ حاضرہ اس امر کے متقضی ہیں کہ اس نکتہ ء خیال میں اصلاح کی جائے۔

باقی رہا خواجہ حافظ کا صوفی ہونا ،سو خواہ وہ صوفی ہوں ،خواہ محض شاعر، ہر دو اعتبار سے ان کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ اور صحیح اندازہ علم الحیات کے اعتبار سے ہونا چاہیے بلکہ ہر شاعر و صوفی و نبی و مصلح کی قدر و قیمت اسی معیار سے جانچی جانی چاہیے اور جو اس معیار پر پورا اترے اس کو اسی وقت دستور العمل بنانا چاہیے۔'' (ص ۱۶۰۔۱۵۹)

''جو کیفیت خواجہ حافظ اپنے ریڈر کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ قوتِ حیات کو ضعیف و ناتواں کرنے والی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت دو طرح سے دیے جا سکتے ہیں۔ فلسفیانہ اور شاعرانہ،مقدم الذکر قسم کا ثبوت اس مثنوی میں کوئی نہیں کیونکہ کتاب نظم ہے اور نظم میں فلسفیانہ ثبوت پیش نہیں کیے جا سکتے۔ اگر یہی مضمون نثر میں لکھا جاتا تو وہ تمام ثبوت لکھے جاتے ۔شاعرانہ ثبوت منطقی اعتبار سے ضروری نہیں کہ صحیح ہوں ۔تاہم اس نکتہ ء خیال سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ مثنوی میں جابجا موجود ہے۔ آپ مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا۔ مسئلہ نہایت دقیق اور گہرا ہے اور چونکہ اس کا تعلق انسان کی موجودہ اور مابعد الموت کی زندگی سے ہے ، اس واسطے ہر ایک آدمی کے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا ضرور ہے۔ میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ نتیجہ بیشتر اقوامِ مشرق کے موجودہ مذاق اور میلانِ طبیعت کے خلاف ہے لیکن مشرقِ قدیم کے حکما اس سے نا آشنا نہیں ہیں اور یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ میں اس نتیجے پر پہنچنے میں فلاسفہء مغرب سے متاثر ہوا ہوں۔اگرچہ میں کوئی غیر معمولی ذہانت و فطانت رکھنے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ کوئی غیر معمولی علم رکھتا ہوں ،تاہم عام لوگوں سے علم اور سمجھ کسی قدر زیادہ رکھتا ہوں ۔جب مجھ کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے بیس سال کی ضرورت ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ عام لوگ جو دنیا کی دماغی اور علمی تاریخ سے پورے واقف نہیں، تھوڑے غور و فکر سے اس کی حقیقت تک پہنچ

جائیں گے۔ اعتراض کرنا دوسری بات ہے۔'' (ص ۱۶۸۔۱۶۷)

اقبال کی نجی جذباتی زندگی پر لکھنے والوں نے تقریباً تمام مواد ان خطوط سے حاصل کیا ہے جو انھوں نے عطیہ فیضی، سینے شیل اور ویگیناسٹ کو تحریر کیے لیکن قارئین کے لیے یہ بات حیران کن ہوگی کہ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام خطوط میں بھی ایسا مواد موجود ہے جن سے اقبال کی نجی زندگی، ذہنی و جذباتی کیفیت کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔مہاراجہ کے نام خطوط میں صنفِ لطیف کے حوالے سے اقبال کے خیالات بھی خاصے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تو اقبال شاد کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے وضع داری کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ وضع داری بے تکلفی میں تبدیل ہو گئی لیکن اس میں شاد کی طرف سے پہل ہوئی ہوگی۔ دونوں کے درمیان وضع احتیاط کا پردہ شاد کے سفرِ پنجاب کے دوران اٹھا ہو گا۔اس سفر میں شاد نے لاہور میں ایک ہفتہ قیام کیا تھا۔ شاد کا یہ قیام جولائی ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ شاد ۱۷ جولائی کو لاہور پہنچے اور ایک ہفتہ یہاں قیام کیا۔اس قیام کے دوران انھوں نے بیسیوں لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اقبال سے بھی ملاقاتیں دلچسپ رہیں۔ ان ملاقاتوں نے اقبال کے حوالے سے شاد کو کافی متاثر کیا ہوگا۔اقبال شاد کو آغا حشر کاشمیری کے تھیٹر بھی لے گئے تھے اور شاد جب لاہور سے پانی پت کے لیے روانہ ہوئے تو ایک طبیب بھی ان کے ہمراہ کر دیا تھا اس سے بھی شاد کافی متاثر ہوئے ہوں گے۔ [۳۶]

اقبال اور شاد کے خطوط میں بعض اوقات مبہم اور غیر واضح جملے ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو سیاسی ہیں لیکن بعض جملے ایسے بھی ہیں جو جنسی حوالوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ بین السطور کی گئیں باتیں اور مبہم جملوں کے نقوش اقبال اور شاد کے خلوتوں سے متعلق خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال اقبال اور شاد کے خطوط سے دونوں کی نجی اور جذباتی حالات کے علاوہ نفسی کیفیتوں کا انکشاف بھی ہوتا ہے لیکن آلِ احمد سرور کا بیان اس کے برعکس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' ان (خطوط) سے اقبال کی مشرقیت وضع داری، محبت، اہل اللہ سے عقیدت اور روحانیت ظاہر ہوتی ہے اور اگر کوئی صرف ان خطوط ہی کو دیکھے تو وہ اقبال کی شخصیت کے صرف ایک پہلو سے واقف ہو سکے گا۔ اقبال بزرگوں کا ادب کرتے تھے۔ وہ خود درویشی، فقر، قلندری اور سادگی کے دلدادہ تھے۔ شاد صوفی تھے بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ ان کا احترام کرنا اس وجہ سے مناسب تھا کہ وہ احترام کے آداب سے واقف تھے مگر اقبال نے شاد کو اس سے زیادہ کچھ اور نہ دیا اور غالباً اس سے زیادہ کے شاد مستحق بھی نہ تھے۔ اس لیے یہ خط اقبال کی پوری شخصیت کو سمجھنے کے لیے زیادہ مفید نہیں۔''[۳۷] ذیل میں اقبال کی جس شخصیت کے نقوش پیش کیے جائیں گے ان سے آلِ احمد سرور غالباً ناواقف نظر آتے ہیں۔

اقبال شاعر کا دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔حسن پرست تھے اور حسن کے شیدائی بھی۔حسن کی کیفیات خواہ انھیں حسین وادیوں میں نظر آئے۔''یہ معلوم نہیں آپ نے کبھی کشمیر کی سیر کی ہے یا نہیں۔میں نے محض اس کے نزدیک کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہر قدم پر قدرت کی دلفریبیاں نظر آتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سرکار وہاں کی سیر کریں تو پنجتنی مذہب کو چھوڑ کر ضرور رشش امامی ہو جائیں۔'' [۳۸] یا صنفِ لطیف میں۔''رسول اکرم فرماتے ہیں: مجھے تمھاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں: نماز، خوشبو اور عورت۔ مجھے ان تینوں میں سے صرف ایک پسند ہے مگر اس تخیل کی داد دینی چاہیے کہ نبی کریم نے عورت کا ذکر دو لطیف ترین چیزوں کے ساتھ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت نظامِ عالم کی خوشبو ہے اور قلب کی نماز'' وہ اس کا بے محابا اظہار کرتے ہیں۔ یورپ میں قیام کے دوران

نسوانی حسن نے ان کے دل میں جو آگ لگائی تھی وہ وطن واپسی کے بعد شعلہء جوالہ بن چکی تھی۔روکھی پھیکی خانگی زندگی نے اس پر جلتی کے تیل کا کام کیا۔عائلی زندگی انھیں گلے کا طوق اور پاؤں کی بیڑی نظر آنے لگی جسے نہ اتارا جا سکتا تھا نہ توڑا جا سکتا تھا۔ معاشرتی رکاوٹیں اس آزادی میں رکاوٹ ڈال رہی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اس آزادی کے مطمئن ضرور رہے۔'' آزادی کی تشریح آپ نے خوب فرمائی۔ میں بھی آپ کے لیے اسی آزادی کا آرزومند ہوں یعنی صنوبر کہ پابندِ باغ بھی ہے اور آزاد بھی۔''[۳۹] ان سطور میں وہ شاد کی آزادی کے مطمئن ہی نہیں اپنی آزادی کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔

عائلی زندگی سے وہ اس حد تک بیزار ہو چکے تھے کہ وہ خانہ بدوش سپیرا بن کر جینے کو ترجیح دینے لگے ۔ بد بخت ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے،شراب نوشی میں پناہ لینے یا خودکشی کر کے روح کا بوجھ اتارنے کی خواہش کرنے لگے۔کتابوں کے خوبصورت اوراق انھیں مردہ اور بنجر نظر آنے لگے یہ اوراق انھیں مسرت دینے کی بجائے وحشت زدہ کرنے لگے۔ ان کا دلِ زندہ دلِ مردہ کا نقشہ پیش کرنے لگا۔'' جس زمانے میں میں زندہ تھا یا یوں کہیے کہ زندہ دل تھا۔۔۔''[۴۰]

اس سے پہلے کہ ان ان کے باطن میں لگی ہوئی آگ انھیں جلا کر خاکستر کر دیتی معاشی ضرورتوں اور وقت کے مرہم نے ان کے باطن میں موجود شعلہء جوالہ کو بظاہر برف کی مانند ٹھنڈا کر دیا۔عشق کی آگ بجھ کر راکھ کے ڈھیر کا نمونہ پیش کرنے لگی ۔شاد کے خطوط سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ راکھ کے اس ڈھیر میں بھی بہت سی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں اور دبی رہیں جو خاص خاص مواقع پر اپنی موجودگی اور حرارت کا احساس دلاتی رہیں۔'' پنجاب کا حال بدستور ہے۔گرمی کا آغاز ہے مگر یہ مارچ کے دن غنیمت ہیں۔کوئی دن میں شگوفے پھوٹیں گے۔ بہار کی تیاری ہے، جنون پھر تازہ ہوں گے۔ میرا جنون ،جو کچھ عرصے پہلے سے مجھے فراموش کر چکا ہے، کیا عجب کہ اس بہار میں عود کر آئے۔آپ بھی دعا کریں کیونکہ آپ مستجاب الدعوات ہیں، گو آپ کو اس کی خبر نہیں ۔''[۴۱]

اقبال تمام عمر گیلی لکڑی کی مانند اندر ہی اندر سلگتے رہے لیکن اس کا دھواں کسی کسی نے دیکھا ۔شاد کے نام اقبال کے خطوط میں راکھ میں دبی ہوئی انھی چنگاریوں اور اڑتے ہوئے دھوئیں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال عورت کو کائنات کی لطیف ترین شے سمجھتے ہیں۔اسی کی وجہ سے زندگی کا سوز و ساز ہے اور کائنات میں رنگا رنگی ہے۔اس صنفِ لطیف کو اسلام نے مردود قرار نہیں دیا بلکہ کائنات میں زندگی کا محرک قرار دیا ہے۔کائنات کی تکمیل اسی کی ذات سے ہوتی ہے۔اس حوالے سے ذیل کا خط پڑھیے ہے:

''لندن میں ایک انگریز نے مجھ سے پوچھا:''تم مسلمان ہو؟'' میں نے کہاں'ہاں! تیسرا حصہ مسلمان ہوں'' وہ حیران ہو کر بولے'' کس طرح؟''میں نے عرض کیا کہ رسول اکرم فرماتے ہیں: مجھے تمھاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں: نماز، خوشبو اورعورت۔ مجھے ان تینوں میں سے صرف ایک پسند ہے مگر اس تخیل کی داد دینی چاہیے کہ نبی کریم نے عورت کا ذکر دو لطیف ترین چیزوں کے ساتھ کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ عورت نظامِ عالم کی خوشبو ہے اور قلب کی نماز۔(ص ۱۵۰)

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب اقبال کا نفسیاتی مطالعہ میں لکھتے ہیں:'' مشرق کے آدابِ شرافت میں شخصیت پرستی کو بلاوجہ جو اساسی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اس کے مضر اثرات نے شخصیت نگاری کو بالخصوص اور تنقید کو بالعموم متاثر کیا ہے ۔جس کی وجہ سے تحریر میں سیرت بھاری سنہری ملبوسات میں لپٹی خوش رنگ اور خوش نظر تو معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت کے رنگ و بو سے عاری رہتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ایک خاص نوع میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ یہ خوف ہے حقیقت کا !حقائق سے آنکھیں چراتے ہوئے یہ باور

کر لینا کہ بس حقیقت کا وجود معدوم ہو گیا یا پھر حقائق کو اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق توڑ موڑ کر حسبِ منشا نیا پیکر عطا کر کے مطمئن ہوجانا یہ انداز ہمارا قومی نشان بن چکا۔ ہم اس پجاری کی مانند ہیں جو بت کو خدا تو بنا سکتا ہے لیکن اسے بت کے روپ میں دیکھنے کی جرات نہیں رکھتا۔''[۴۲] ہم میں سے بہت سے اقبال کو اسی جذبے کے ساتھ دیکھتے اور دکھاتے ہیں کبھی صوفی کا روپ دے کر کبھی درویش کی صورت بنا کر اور کبھی قلندر کے بہروپ میں اور کبھی فرشتہ بنا کر لیکن انھیں بہت کم انسان کے روپ میں بھی پیش کیا گیا۔ یہ خطوط عام انسانی رویوں کے ترجمان ہیں اور اقبال کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جن کا اظہار دوسرے لوگوں کے خطوط میں اس طور نہیں ہو پایا۔ ان خطوط میں وہ ترجمانِ حقیقت ،رہبرِ شریعت اور پیرِ طریقت کے مقامِ بلند پر فائز نظر نہیں آتے بلکہ ہمارے جیسے ایک عام انسان نظر آتے ہیں۔ وہ ایک زندہ دل انسان کی طرح قدرت کی نعمتوں اور حسنِ فطرت کے جلووں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ وہ حسن پرست بھی ہیں اور اس کے ثنا خواں بھی اور حسن کی رعنائیوں کو کشید کرنے کے خواہش مند بھی۔ ذیل کی عبارتیں ملاحظہ کیجیے:

ایک مطربہ پنجاب میں رہتی ہے۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں مگر سنا جاتا ہے کہ حسن میں لاجواب ہے اور اپنے گزشتہ اعمال سے تائب ہو کر پردہ نشینی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ چند روز ہوئے اس کا خط مجھے موصول ہوا کہ مجھ سے نکاح کر لو۔ تمھاری نظم کی وجہ سے تم سے غائبانہ پیار رکھتی ہوں اور میری توبہ کو ٹھکانے لگا دو۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ اس کارِخیر میں حصہ لوں مگر کمر میں طاقت ہی نری کافی نہیں، اس کے لیے دیگر وسائل بھی ضروری ہیں۔ مجبوراً مہذبانہ انکار کرنا پڑا۔'' (ص ۱۵۰)

مذکورہ بالا خط میں لکھتے ہیں: سرکار نے جو نسخہ میرے لیے تجویز فرمایا ہے ،ضرور مفید ہو گا کیونکہ مجرب ہے اور مجھے اس کے استعمال کی خواہش بھی بہت ہے مگر نری خواہش سے کام نہیں چلتا۔ استعمال کے وسائل بھی ضروری ہیں اور وہ مفقود ورنہ یہ تو وہ چیز ہے کہ ''خمارے حدمن بجرھاھمی طلبند'۔'' (ص ۱۴۹)

اسی خط میں مطربہ کے بارے میں بات کر کے لکھتے ہیں:

''اب بتائیے کہ آپ کا نسخہ کیسے استعمال میں آئے مگر میں آپ کی ولایت کا قائل ہوں کہ آپ نے ایسے وقت یہ نسخہ تجویز فرمایا کہ مریض کی طبیعت خود بخود ادھر مائل تھی۔ نسخہ مجھے دل سے پسند ہے مگر اس کو کسی اور وقت پر استعمال میں لاؤں گا، جب حالات زیادہ مساعد ہوں گے۔'' (ایضاً)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''لاہور میں گرمی کا زور ہے اور اس پر مس گوہر جان (کلکتے کی مشہور کلاکار) کا نغمۂ جگر سوز فضائے لاہور کی حدت پر مستزاد ہے۔ مولانا اکبر نے خوب ارشاد فرمایا تھا:

نصیب ایسا کہ رکھتی ہے زر و سیم و گہر گوہر　　　میسر ہے اسے ہر چیز دنیا میں، مگر شوہر (ص ۱۶۸)

ایک اور خط دیکھیے:

''جس زمانے میں میں زندہ تھا، یا یوں کہیے کہ زندہ دل تھا، تو تجربے نے یہ اصول سکھایا کہ جس معشوق سے زیادہ محبت ہو،

اس سے اصولاً زیادہ بے اعتنائی کرنی چاہیے یار لوگوں نے فرمائش کی ہے کہ ہر اصول پر ایک مفصل رسالہ لکھا جائے کہ تماش بینوں کے لیے رہنمائی کا کام دے ۔سو بندہ نے ایک رسالہ موسوم بہ ''اجرالسکوت'' تحریر کیا ہے ۔جس میں سکوت کے ایسے ایسے دلائل پیش کیے ہیں کہ فریدالدین عطار بھی اگر رسالے کو پڑھے تو اپنے فضائلِ خاموشی کو فراموش کر جائے۔ وہ رسالہ سینہ بہ سینہ شائع ہوتا تھا مگر اب اس کا نشان باقی نہیں کہ وہ محرکات نہیں جو اس رسالے کی تصنیف کا باعث ہوئے ۔''(ص ۱۳۹)

یہ خطوط اقبال کی زندگی کے ایسے پہلو کو سامنے لاتے ہیں۔جس میں اقبال کی زندگی کے ایک خاص رخ ،ذہنی رویے،نفسی کیفیت ،خیالات اور جذبات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط میں وہ ایک ایسے انسان کے روپ میں سامنے آئے ہیں جو ماورائی صفات کے حامل نہیں بلکہ ایک گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان نظر آتے ہیں،جن کے دل میں خواہشات اورامنگیں انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں لیکن معاشی مسائل ،معاشرتی بندھن اور مجبوریاں انھیں '' کارِ خیر میں حصہ لینے سے'' نہیں دیتیں۔یہ مسائل ان کی قلبی حدت کو بھڑ کنے نہیں دیتیں بلکہ ٹھنڈا کیے رکھتی تھیں۔مذکورہ بالا اول الذکر خط میں '' دل تو یہی چاہتا تھا کہ اس کارِ خیر میں حصہ لوں مگر کمر میں طاقت ہی نری کافی نہیں ''اقبال کی نفسیاتی صورتِ حال کی پیش کش اس سے بہتر انداز میں شاید ہی کسی خط میں ہوئی ہو۔

پروفیسر مجیب نے لکھا ہے :''اقبال نے اپنی شخصیت پر خود بھی بہت سے پردے ڈال رکھے تھے۔ وہ ہر ایک کو اپنی اصلی جھلک دکھاتے بھی نہ تھے۔ غالباً ہر ایک اس کی تاب بھی نہ لا سکتا تھا۔[۴۳] لیکن شاد ان لوگوں میں شامل تھے جنھیں اقبال اپنی شخصیت کی اصلی جھلک دکھانے میں بھی کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتے۔شاد کے نام خطوط میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں اقبال نے اپنا دل کھول کر شاد کے سامنے رکھ دیا ہے۔کہیں مخفی انداز میں تو کہیں عیاں۔لیکن ان دھندلے اورواضح نقوش کو اگر ترتیب سے رکھ کر دیکھا جائے تو اقبال کی ایسی تصویر سامنے آتی ہے جو حقیقی جذبات کی حامل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ان خطوط میں اقبال ایک زندہ اور جیتے جاگتے انسان کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اقبال کے خطوط بعض اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ان خطوط سے ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۶ء تک کے عرصے پر محیط اقبال کی علمی،شعری اور سیاسی مصروفیات کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ اقبال کی نجی زندگی کے بعض تلخ واقعات سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔ یہ خطوط اقبال کی بعض شعری تخلیقات کے محرکات، ان کے ابتدائی متون، ردکردہ کلام کو جاننے اور ان کی تخلیق کے وقت کا تعین کرنے میں بھی مددگار ہیں۔ ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو قوالی سننے[۴۴] (ص۲۵۰) اور درویشوں سے ملنے کا بھی بہت شوق تھا۔[۴۵] وہ رامائن[۴۶] اور گیتا[۴۷] کے اردو تراجم کرنا چاہتے تھے۔اقبال کو سر کا خطاب ملنے کی تاریخ کا پتا چلتا ہے[۴۸] فارسی مثنوی اسرارِ خودی اور رموز بے خودی کے بارے میں بعض اہم معلومات بھی انھیں خطوط سے مہیا ہوتی ہیں۔[۴۹] ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسرارِ خودی ان کی باطنی تحریک کا نتیجہ ہے جو خالقِ حقیقی کی طرف سے ان کے دل میں ڈالا گیا تھا۔[۵۰] مزید یہ کہ اس مثنوی کے دوسرے حصے کا کچھ حصہ لاہور سے باہر ایک گاؤں میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔[۵۱] حیدر آباد کے مسائل سے ان کی دلچسپی اور واقفیت ،برار کے مسئلے کے حل کے لیے ان کے قانونی مشورے[۵۲] پیش گوئیاں[۵۳] اور رائل کمیشن کی آمد کے وقت اپنی خدمات کی پیش کش[۵۴] کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علی امام کے متعلق ان کی رائے ،[۵۵] ادبی مباحث ،علمی مسائل ،فلسفیانہ موضوعات، مذہبی موضوعات، نجی حالات،نفسی کیفیات مجبوریاں ،محرومیاں، پریشانیاں ،محبتیں، کلفتیں اور اسی نوع کے دیگر امور کے

بارے میں معلومات ان خطوط سے حاصل ہوتی ہیں ۔کچھ امور اور موضوعات ایسے بھی ہیں جو ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں گم ہو کر رہ گئے ۔مختلف النوع الجھنوں نے ان کو وجود میں آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

غرض' اقبال بنام شاد' میں موجود خطوط سے اقبال اور شاد کے تعلقات پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ یہ خطوط ایک طرف ادبی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل ہیں تو دوسری طرف ان خطوط سے اقبال اور شاد کے نجی معاملاتِ زندگی بھی سامنے آتے ہیں۔ ان خطوط میں حیدرآباد دکن کے بطور سیاسی و ادبی مرکز کی اہمیت کا بھی پتا چلتا ہے اور اس کی ثقافتی اور تہذیبی صورتِ حال بھی اجاگر ہوتی ہے۔ ان خطوط میں اقبال ایک ادیب ،شاعر اور مفکر کے روپ میں تو سامنے آتے ہی ہیں لیکن یہ ایک دردمند، حساس ، عام انسانی جذبات اور بشری صفات کے حامل شخص کی صورت میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان خطوط سے ہم اقبال کو ایک شاعر ،ایک ناقد ،ایک مفکر ،ایک دوست اور سب سے بڑھ کر ایک انسان کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس طرح یہ مجموعہء مکاتیب اولین مجموعہ ہائے مکاتیب میں نہ صرف ادبی اہمیت کا حامل ہے بلکہ اقبال شناسی کی روایت میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اقبال اور شاد اور ان کے تعلقات کو جاننے ،سمجھنے، پرکھنے کا ایک اہم ترین اور بنیادی مآخذ کی حیثیت کا حامل بھی ۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ اقبال خان محمد نیاز الدین خان کے نام خط میں لکھتے ہیں: '' مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ کچھ عرصہ ہوا جب انھوں نے میرے بعض خطوط ایک کتاب میں شائع کر دیے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی کی خطوط ہمیشہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں ،مگر اشاعت ان کی نظر ثانی کے بغیر نہیں ہونی چاہیے ۔اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرزِ بیان میں خصوصیت کے ساتھ لا پرواہوں ۔امید ہے آپ میرے خطوط کو اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہوں گے۔خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی،مکتبہ خیابان ادب لاہور،۱۹۷۶ء ص۳۳۔۳۲

۲۔ شاد اقبال، مرتبہ محی الدین قادری زور، اعظم سٹیم پریس،حیدرآباد،۱۹۴۲ء

۳۔ ایضاً ۔مقدمہ ص۳۶ زور کا بیان ہے: '' اس مجموعے جو خطوط شائع کیے جا رہے ہیں وہ مہاراجہ کی وفات سے دو تین سال قبل ہی بغرض اشاعت وصول ہوئے تھے لیکن ان کی ترتیب و طباعت میں اتنی تعویق ہوگئی کہ یہ مجموعہ ان کی وفات کے دو تین سال بعد شائع ہو رہا ہے۔''

۴۔ دیکھیے: کلیات مکاتیبِ اقبال مرتبہ مظفر حسین برنی۔کلیات مکاتیب اقبال کی پہلی جلد ۱۹۸۹ء میں دوسری جلد ۱۹۹۱ء میں اور تیسری جلد۱۹۹۳ء میں اردو اکادمی دہلی سے شائع ہوئی۔

۵۔ دیکھیے: اقبال نامہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال ،شیخ عطاء اللہ ،اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء ص۵۲۱۔۴۶۲

۶۔ صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول ، شمارہ ۶۵ ،اکتوبر ۱۹۷۳ء ،ص۲۷

۷۔ اقبال بنام شاد مرتبہ عبداللہ قریشی، بزم اقبال، لاہور اول ۱۹۸۶ء ص ۵۶، صحیفہ ص ۹۹

۸۔ اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، شیخ عطاء اللہ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۴۶۱

۹۔ شہر نگاراں، سبط حسن، دانیال کراچی، ۱۹۸۵ء دوم ص ۴۹

۱۰۔ ایضاً ص ۱۲۱

۱۱۔ پھر نظر میں پھول مہکے، مرزا ظفر الحسن، کتب پرنٹرز و پبلشرز لمیٹڈ، کراچی، اپریل ۱۹۷۴ء

۱۲۔ اقبال کی دو نظمیں اور ان کا پس منظر تحسین سروری، صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول، شمارہ ۶۵، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۶۲۔۶۱

۱۳۔ اقبال اور حیدر آباد، نظر حیدر آبادی، ص، اقبال اکادمی، کراچی، اشاعت اول ۱۹۶۱ء ص ۱۴

۱۴۔ دیکھیے اقبال کی دو نظمیں اور ان کا پس منظر، تحسین سروری، صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول، شمارہ ۶۵، اکتوبر ۱۹۷۳ء ص ۶۶

۱۵۔ شہر نگاراں، سبط حسن، ص ۶۸۔۶۷

۱۶۔ دیکھیے: پھر نظر میں پھول مہکے، مرزا ظفر الحسن، ص ۲۶۔۱۷

۱۷۔ یہ فہرست مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات مصنفہ مہدی نواز جنگ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۰ء سے حاصل کی گئی ہے۔

۱۸۔ اقبال اور حیدر آباد ص ۲۰۰

۱۹۔ اقبال بنام شاد مرتبہ عبداللہ قریشی ص ۲۹

۲۰۔ شاد اقبال، مرتبہ محی الدین قادری زور، اعظم سٹیم پریس حیدر آباد، ۱۹۴۲ء، ص ۲۵

۲۱۔ دیکھیے: اقبال بنام شاد مرتبہ عبداللہ قریشی، ص ۲۸۷، ۲۹۴، ۲۹۷، ۳۱۱، ۲۹۷، ۷۷

۲۲۔ اقبال، از عطیہ بیگم، مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی، اقبال اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۶ء، اول ص ۵۲۔۵۱۔ اس حوالے سے عطیہ فیضی کا بیان ہے'' اس کے بعد میں نے ایک اور سخت لکھا ہوگا جس میں انھیں بتایا ہوگا کہ اگر انھوں نے کسی ہندوستانی ریاست کی ملازمت قبول کر لی تو وہ اپنی خداداد غیر معمولی قابلیت کو کھو بیٹھیں گے۔ ان کا ۱۷، پریل ۱۹۱۹ء خط خود ایک اپنی تشریح ہے۔۔۔(اقبال لکھتے ہیں) انھوں (اکبر حیدری) نے آپ کو اس حد تک میرے خلاف بدظن کر دیا ہے کہ آپ مجھ پر عدم اخلاص اور عدم صداقت کا الزام دھر رہی ہیں۔ مہربانی کر کے میرے حیدر آباد جانے کے بارے میں کوئی نتائج اخذ نہ کیجیے۔ مثلاً یہ کہ نظام کی جانب سے قدر شناسی وغیرہ تاوقتیکہ میرا بیان نہ سن لیں۔ میں اتنا لمبا سفر محض دوستوں سے ملنے کی خاطر اختیار نہیں کر سکتا تھا ایسے میں جب کہ مجھ میں ایسا کرنے کی قدرت نہ تھی۔ میں آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حیدر آباد کی سوسائیٹی کے بارے میں جو کچھ آپ کہتی ہیں اس سے میں متفق ہوں''

۲۳۔ اقبال اور حیدر آباد ص ۲۰

۲۴۔ دیکھیے: مقدمہ اقبال بنام شاد ص ۴۹۔۴۷

۲۵۔ مقدمہ اقبال بنام شاد ص ۴۸۔۴۷

۲۶۔ شہرِ نگاراں، ص ۶۹

۲۷۔ اقبال از عطیہ فیضی، ص ۳۶۔ اقبال عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں: ''میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرض دار ہوں اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔''

۲۸۔ اقبال بنام شاد ص ۲۳۸

۲۹۔ ایضاً ص ۲۷۹

۳۰۔ ایضاً ص ۲۴۱

۳۱۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی، مرتبہ عبداللہ قریشی، اول ترتیب پبلشرز، لاہور۔س۔ن، ص ۴۸۳۔

۳۲۔ اقبال بنام شاد ص ۲۰۵

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ایضاً ص ۱۰۷

۳۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: زندہ رود (۲) جاوید اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، دوم ۱۹۸۳ء، ص ۲۴۲۔۲۰۰

۳۶۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات، مہدی نواز جنگ، حیدر آباد دکن، ۱۹۵۰ء ص ۲۱۵ (۲) شاد اقبال مقدمہ ص ۱۶۔۱۵

۳۷۔ اقبال اور ان کا فلسفہ، آلِ احمد سرور، مکتبہ عالیہ، لاہور، جنوری ۱۹۷۷ء ص ۱۰۵

۳۸۔ اقبال بنام شاد مرتبہ عبداللہ قریشی ص ۱۲۷

۳۹۔ ایضاً ص ۱۳۲

۴۰۔ ایضاً ص ۱۳۹

۴۱۔ ایضاً ص ۱۵۷۔۱۵۶

۴۲۔ اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، ڈاکٹر سلیم اختر، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۷ء ص ۲۰

۴۳۔ اقبال بنام شاد مرتبہ عبداللہ قریشی ص ۵۹

۴۴۔ ایضاً ص ۲۵۰

۴۵۔ ایضاً ص ۲۵۸، ۲۰۵

۴۶۔ ایضاً ص ۲۵۲

۴۷۔ ایضاً ص۲۵۷

۴۸۔ ایضاً ص۳۵۷

۴۹۔ ایضاً ص۱۸۶۔۱۵۸

۵۰۔ ایضاً ص۱۶۳

۵۱۔ ایضاً ص۱۸۶

۵۲۔ ایضاً ص۲۷۴

۵۳۔ ایضاً ص۱۰۲،۲۷۵۔ اقبال ۲۸،اگست ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''یورپ میں ایک خوفناک جنگ ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ یہ وہی جنگ ہو جس کا ذکر پرانی کتبِ مقدسہ میں ہے۔'' (ص۱۰۲)

۱۹، اپریل ۱۹۲۳ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آیندہ تیس سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی۔''(ص ۲۷۵)

اقبال کی دونوں پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔ پہلی جنگ عظیم اسی سال چھڑ گئی اور ہندو مسلم علیحدگی ان کے اندازے سے چھ سال پیش تر ہی انجام کو پہنچ گئی۔

۵۴۔ ایضاً ص۲۸۲

۵۵۔ ایضاً ص۱۲۰